لوکاچ اور مارکسی تنقید
اصغر علی انجینیر

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

لوکاچ اور مارکسی تنقید

مصنّف

اصغر علی انجینیر

ناشر

دارالاشاعت ترقی دہلی

LOKACH AUR MARKSI TANQED
By ASGHAR ALI ENGINEER

اشاعت ۱۹۸۲ء
تعداد ایک ہزار
قیمت مجلّد ۳۰ روپے غیر مجلّد ۲۳ روپے
مطبوعہ نیو دیپ آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۶

ناشر: دارالاشاعت ترقی - ۳/۱۴۱۰ ، رام نگر - شاہدرہ - دہلی ۳۲

پہلا باب

مارکسی مفکروں میں لوکاچ کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔ لوکاچ کا شمار بے شک بیسویں صدی کے ان مفکروں میں کیا جا سکتا ہے جنہوں نے انسانی فکر و ادب کو اپنی ذہنی کاوشوں سے مالا مال کیا ہے۔ لوکاچ کا بیاسی سالہ ارضی سفر ہر معنی میں کامیاب سفر تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو زندگی سے جتنا حاصل کرتے ہیں اس سے زیادہ اسے بخش دیدیتے ہیں۔ گویا لوکاچ کے زندگی کے بہی کھاتے میں ہمیں دھالے سے زیادہ جمع ہی ملے گا۔ ہم اس مقالے میں پہلے لوکاچ کے سوانح حیات کا جائزہ لیں گے اور پھر اس کی ذہنی حاصلات کا۔

لوکاچ ۱۳۔ اپریل ۱۸۸۵ء میں بوڈاپیسٹ میں جو آسٹرو ہنگیری شاہوں کا دارالحکومت تھا پیدا ہوا تھا گیورگی لوکاچ GYORGY LUKACS اپنے امیر باپ جوزیف لوکاچ کا دوسرا لڑکا تھا اس کی ماں آڈیل ورتھائمیر ADEL WERTHEIMER تھی۔ لوکاچ خاندان کا تعلق یہودی خاندان سے تھا۔ لوکاچ گیورگی کے دو بھائی تھے ایک اس سے بڑا دوسرا چھوٹا۔ چھوٹے بھائی کا ۱۸۹۲ء میں تین سال کی عمر میں ہی انتقال ہو گیا اور بڑا بھائی یانوس JANOS ۱۹۴۴ء میں ۶۰ سال کی عمر میں نازیوں کے ہاتھ مارا گیا۔ گیورگی کی ایک بہن بھی ہے جو ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئی اس کا نام ماریا رکھا گیا۔

لوکاچ کا دادا جیکوب لوینگیر JAKOB LOWINGER ایک معمولی دست کار تھا جو اپنے بچوں کی تعلیم کا بھی ٹھیک سے انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ گیورگی لوکاچ کے والد کو ۱۸۶۹ء میں ۱۴ سال کی عمر میں ہی اپنی تعلیم نامکمل چھوڑ کر زیگید SZEGED جو جنوبی ہنگیری میں واقع ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اس کے بنک میں ایک تربیتی امیدوار APPRENTICE کے طور پر داخل ہونا

پڑا۔ جوزیف لوکاچ ایک بڑا ہی محنتی انسان تھا۔ اور مالیاتی امور میں بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا بینک کاری کی تربیت کے دوران ہی شام کی فرصت کے اوقات میں جوزیف لوکاچ (گریگوری لوکاچ) کے والد نے کئی غیر ملکی زبانوں میں مہارت حاصل کر لی اور ۱۸ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اینگلو ہنگیرین بینک واقع بوڈاپیسٹ BUDAPEST میں چیف کریسپونڈنٹ کی آسامی پر مقرر ہو گیا۔ یہی نہیں اپنی ذہانت اور محنت سے آگے ترقی کر کے ہنگیری کی جنرل گریڈٹ بینک کے ایک اہم شعبے کا اعلیٰ ترین افسر بن گیا اور ۲۵ سال کی عمر میں اینگلو آسٹرین بینک میں ڈائریکٹر کا عہدہ حاصل کر لیا اور بعد میں (یعنی ۱۹۰۶) وہ ہنگیری جنرل گریڈٹ بینک میں مینجنگ ڈائریکٹر کی آسامی پر مقرر ہو گیا۔ اور اسی عہدے پر ۱۹۱۹ تک قائم رہا۔ ۱۹۱۹ میں اسے اس عہدے سے ہورتھی HORTHY حکومت نے اس جرم میں الگ کر دیا کہ اس کا بیٹا (لوکاچ) ۱۹۱۹ کے کمیون میں شرکت کر رہا تھا۔

گیورگی کے والد نے ۱۸۸۲ء میں اپنی شادی سے چند روز پہلے ہی اپنا نام بدل کر لوکاچ رکھ لیا اور ۱۸۹۹ء میں اسے جوزیف زیگیڈی لوکاچ کے نام سے اشرافیہ کی صف میں داخل کر لیا گیا۔ (یہی وجہ ہے کہ گیورگی لوکاچ نے اپنی اولین تحریروں پر جرمن زبان گیورگ فون لوکاچ GIEORG VON LUKACS کے نام سے دستخط کیے ہیں۔ اس زمانے کا جرمن اشرافیہ اسی طرح دستخط کیا کرتا تھا۔ لوکاچ کی ماں کی تربیت ویانا میں ہوئی تھی اور اس نے ہنگیری زبان اپنی شادی کے بعد بوڈاپیسٹ آکر ہی سیکھی تھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ خاندان کی زبان شروع سے جرمن رہی تھی اور اسی وجہ سے لوکاچ کے لیے جرمن ادب اور فلسفے سے واقفیت کا مسئلہ بہت آسان ہو گیا۔

لوکاچ کی پہلی تحریر ۱۹۰۲ء میں یعنی ۱۷ سال کی عمر میں MAGYAR SZALON شائع ہوئی۔ لوکاچ کی اولین تحریریں تھیٹر پر آلفریڈ کیر کی تاثراتی اسٹائل سے متعلق تھیں۔ لوکاچ نے تخلیقی ادب کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی کوشش کی اور ۱۹۰۲ سے لے کر ۱۹۰۳ تک پانچ ڈرامے لکھ ڈالے۔ یہ ڈرامے ابسن اور گرہارٹ ہاؤپٹ مین GERHART HAUPTMANN سے متاثر ہو کر لکھے گئے تھے۔ لیکن لوکاچ نے محسوس کیا کہ تخلیقی ادب اس کا میدان نہیں ہے اور بعد میں اس نے یہ پانچوں ڈرامے نہ صرف جلا ڈالے بلکہ اس نے اس میدان میں کبھی طبع آزمائی نہ کرنے کا عہد کر لیا جسے اس نے تادم حیات نبھایا۔ لیکن ڈرامے میں اس کی دلچسپی برقرار رہی اور اس کی

دلچسپی کا دائرہ وسیع ہو کر تخلیقی فنون پر حاوی ہو گیا۔ اسی زمانے میں لوکاچ نے جدید ادیبوں اور
فن کاروں کی تخلیقات میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ۱۹۰۳ء میں اس نے MAX
NORDAU کی کتاب ENTARTUNG کے بارے میں سخت اختلاف کیا کہ بادلیر، ابسن، ٹالسٹائی
وغیرہ زوال پذیر فن کار ہیں۔

لوکاچ کو تھیٹر سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں اس نے اپنے دو ساتھی لازلو بانوزی
اور ساندور ہیویسی کے ساتھ مل کر ایک نئے تھیٹر گروپ "تھالیا" کی بنیاد ڈالی۔ ہیویسی بعد میں
ہنگری کے قومی تھیٹر کا ڈائریکٹر مقرر ہوا اور اس نے ڈرامے کے فن پر کئی تحریریں شائع کیں۔ اپنے
والد اور اپنے دوست بانوزی کے زیر اثر لوکاچ کو فلسفے سے بھی گہری دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس نے
اسی زمانے میں کانٹ، دلتھی DILTHEY اور سمیل SIMMEL کی تصانیف کا باقاعدہ
مطالعہ شروع کر دیا۔ لوکاچ کے والد چاہتے تھے کہ اس کا بیٹا قانون کی تعلیم حاصل کرے اور
اپنے والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے لوکاچ نے بوڈاپیسٹ یونیورسٹی میں قانون کا مطالعہ
شروع کر دیا اور ۱۹۰۶ء میں کولوزوار KOLOZSVAR یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لا کی ڈگری
حاصل کر لی۔

اس نے اپنا پہلا مضمون THE FORM OF THE DRAMA اسی زمانے میں لکھا
اور اسے SZERDA نام کے رسالے میں شائع کروایا جو چند دنوں میں ہی بند ہو گیا۔ اس نے
اب اور کئی رسالوں میں باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔ سیاست میں شروع سے ہی اس کا رجحان
دقیانوسیت کے خلاف تھا لیکن فلسفے میں لوکاچ جرمن کلاس کے فلسفے سے زیادہ متاثر تھا
اور اسی وجہ سے وہ انگلش اور فرانسیسی فلسفے میں ثبوتیت کے رجحان کا مخالف تھا۔ ہم آگے چل کر
لوکاچ کے نظریوں سے بحث کرتے ہوئے دیکھیں گے کہ اس پر جرمن فلسفے کا گہرا اثر آخر تک
قائم رہا اور اسے روسیوں سے اسٹالن کے دور میں بھی یہی شکایت رہی کہ وہ جرمن فلسفے کی روایت
سے کما حقہٗ واقف نہ ہونے کی وجہ سے مارکس کے فلسفے کو ثبوتیت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش
کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے مارکسزم کی بنیادی اسپرٹ میں تحریف پیدا ہو جاتی ہے۔

اس دوران میں لوکاچ ڈرامے کے فن اور تنقید سے برابر دلچسپی لیتا رہا۔ اس کا ثبوت
ڈرامے کے فن پر اس کا وہ یادگار مسودہ ہے جو اس نے برلن جا کر ہنگیری زبان میں "جدید
ڈرامے کے ارتقا کی تاریخ" کے عنوان سے لکھا۔ یہ تصنیف اس کی ۶ سالہ نظریاتی اور عملی طور پر

ڈرامے کے فن سے گہری دلچسپی کا نتیجہ تھی۔ یہ مسودہ ۱۹۰۷ء میں مکمل ہوا اور لوکاچ نے اسے ایک اہم ادبی انجمن کو پیش کیا۔ ۱۹۰۸ء میں اس سوسائٹی نے اس اہم تصنیف پر کرزتینا لوکاچ انعام دیا۔ لوکاچ نے ۱۹۱۱ء میں اس کتاب کو نظر ثانی کرنے کے بعد دو جلدوں میں بوڈاپیسٹ سے شائع کیا)۔ لوکاچ نے NYUGAT نام کے ادبی رسالے میں جو ۱۹۰۸ء سے شروع ہوا تھا، لکھنا شروع کیا حالانکہ وہ اس رسالے کے سیاسی و ادبی نظریات سے، جو بورژوا روشن خیالی اور لبرل ثبوتیت کے علمبردار تھے، پوری طرح متفق نہیں تھا۔ لوکاچ کا نظریہ اس وقت تک رومانوی سرمایہ دارانہ مخالفت پر مبنی تھا۔ ۱۹۰۹ء میں لوکاچ کو بوڈاپیسٹ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری دی (جو HORTHY حکومت نے ۱۹۲۰ء میں کمیونسٹ تحریک میں شرکت کرنے کے الزام میں واپس لے لی)۔ اسی زمانے میں لوکاچ نے ٹامس مین پر اپنے طویل مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۹۰۹ء کے آس پاس لوکاچ نے برلن یونیورسٹی میں جیورج سمل کے لیکچرز میں شرکت کی۔ جلد ہی اس کا پسندیدہ شاگرد بن گیا اور اب اس کے گھر میں ہونے والے فلسفیانہ مذاکروں میں شرکت کرنے لگا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب لوکاچ نے وہ مضامین لکھے جو ہنگیری میں ۱۹۱۰ء میں اور جرمن زبان میں ۱۹۱۱ء میں AESTHETIC CULTURE اور THE SOUL AND THE FORMS کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد سے لوکاچ نے زیادہ تر جرمن زبان میں لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور انہیں جرمن تصانیف کی بنا پر اسے اس کے جرمن نام (GEORG LUKACS) کے نام سے عالمی شہرت نصیب ہوئی (ہنگیری زبان میں اس کے نام کا تلفظ GYORGY LUKACS ہے)۔ یہیں سے لوکاچ کی فکر میں ایک اہم موڑ آیا۔ لوکاچ کی سوچ میں یہ موڑ خود بڑی پیچیدہ ذہنی ارتقا کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے وسط یورپ کے دانشوروں میں جمالیت یعنی AESTHETICISM کا بڑا چرچا تھا اور ان حلقوں میں رجحان بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ لوکاچ اس رجحان سے ہٹ کر اب LEBENSPHILOSOPHIE یا (حیویت) VITALISM جسے وجدانیت TUITIONISM بھی کہا گیا ہے کی طرف راغب ہوا۔ ظاہر ہے فلسفے کا یہ مکتب خیال عقل پرستی اور سائنسی فکر سے بالکل تضاد رکھتا ہے۔ ویسے لوکاچ نے بوڈاپیسٹ میں ہی، جہاں اسے ۱۹۰۶ء میں فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی، NEO KANTIAN فلسفے کی اس تعلیم کو تسلیم کر لیا تھا کہ تجربی حقیقت EMPIRICAL REALITY کی باقاعدہ تفتیش و تحقیق کا کام مخصوص علوم

ذہنوں سے ہے اور فلسفہ محض منطق اور نظریۂ علم تک ہی محدود ہے۔ لیکن لوکاچ مطالعہ بہت وسیع تھا اور حقیقت کی تلاش مسلسل اور انتھک ـــــ جواں عمری سے ہی لوکاچ نے مسلسل تلاش کی صحرا نوردی شروع کر دی تھی۔ اسی لیے اس نے اپنی پختہ عمری اور یقین کی پختگی حاصل کرنے تک کبھی ایک ہی منزل پر ٹھہر کر درماندگیٔ ذہن کا ثبوت نہیں دیا۔ اس لیے لوکاچ پر LEBENSPHILOSPHIE کا بھی مستقل اثر نہیں رہا۔ اسی زمانے میں لوکاچ گیورگ سمل، ولہیلم ونڈل بنڈ اور ہائنرس رکیرٹ جس کے لیکچرز اس نے ہائیڈل برگ میں ۱۹۱۲-۱۴ سنے، کے بھی زیر اثر رہا۔

جورج لشتھائم لوکاچ پر اپنی کتاب جو ماڈرن ماسٹرز کے سلسلے میں چھپی ہے کہتا ہے کہ "پہلی جنگ عظیم سے پہلے ان برسوں میں (یعنی ۱۹۱۴-۱۹۱۵ کے آس پاس) جرمن دانشورانہ زندگی نیو کانٹین مکتب خیال کو ختم کرنے، مظہریت HUSSERL کو ابھارنے اور غیر عقلی وجدانیت جس کا سلسلہ بالآخر رومانی تحریک سے ملتا تھا، کو پروان چڑھانے پر مرکوز کیے ہوئے تھی" ظاہر ہے ایسے ماحول میں لوکاچ بھی ان اثرات سے بے نیازانہ کیسے گزر سکتا تھا جب کہ اس کا نہ تھکنے والا ذہن تمام مکاتیب کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ لوکاچ کی ذہنی اٹھان کا زمانہ دراصل وسطی یورپ میں علمی تحریکوں کے اعتبار سے بہت ہی اہم زمانہ تھا اسی زمانے میں جرمنی وغیرہ میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ فلسفے کا جائزہ اور اصل مقصد کیا ہے؟ بعض اہل دانش کا خیال تھا کہ فلسفے کا رول ایک عمومی GENERAL طریق کار سے زیادہ نہیں ہے۔ دوسری طرف دلتھی اور سمل نیچرل سائنسی علوم کی ثبوتیت کی مخالفت کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ یہ لوگ ماربورگ اسکول کے بھی خلاف تھے جو اس بات کا قائل تھا کہ خارجی حقیقت کی سچائی تک رسائی کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ سمل وغیرہ ہنیری برگساں کے زیر اثر اس بات کے قائل تھے کہ (حقیقت) کی ماہیت تک عقلی وجدان کے ذریعے رسائی ممکن ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک برگساں کا تخلیقی ارتقاوالا نظریہ بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔

دلتھی جس کا اثر لوکاچ نے قبول کیا تھا علوم انسانی HUMANITIES میں علت و معلول کے رشتے کا قائل نہیں تھا اور اس طرح اس کے نزدیک ان علوم میں عقلی طریقۂ کار کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ دلتھی اس بات کا قائل تھا کہ ایک مورخ کو ماضی کی "تعبیر HERMENEUTIC UNDERSTANDING" اس دور کے لوگوں کے خیالات کو اپنے تخیل میں دوبارہ پیدا کر کے ہی کرنا ممکن ہے۔ اپنے تخیل کو دوسری روحانی سمت میں لے جا کر ـــــ اس عمل کو

دلتھی شلائی ماخیر کے۔ دلی علم الٰہی کے تتبع میں احیائی RETIRING کہتا ہے —— یہیں
اس کی تفہیم ممکن ہے۔ دلتھی کے اس تعبیری طریقہ کار HERMENEUTICS میں علت و معلول
یا عملی رشتے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس طریقہ کار کے مطابق ہر شے کی ایک سری
HIDDEN اہمیت ہے جس کو روحانی تعبیر کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ دلتھی کا یہ
طریقہ کار جرمن فلسفے کی روایت میں گہری جڑیں رکھتا تھا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہمبولڈ
نیبھور، بسیوگنی، شلائی ماخیر وغیرہ اسی اسکول کے نمائندے سمجھے جاتے تھے۔ یہ طریقہ کار ثبوتیتی
مکتبِ فکر سے بالکل الگ تھا جس میں ہر مظہر کو علت و معلول کے رشتے میں ہی سمجھنے کی کوشش
کی جاتی ہے۔ دلتھی کا طریقہ کار چونکہ سائنسی کلیوں کی طرح علت و معلول کے رشتے کا پابند
ہونے کی بجائے اپنی ایک خود مختاری رکھتا تھا فن کاروں اور ادیبوں میں زیادہ مقبولیت
رکھتا تھا۔ عقلیت کے خلاف بغاوت کرنے والے تخلیقی فن کار اس کا بخوشی سہارا لے سکتے
تھے۔ آگے چل کر ونڈلبنڈ، رکرٹ، دلتھی، سمل وغیرہ نے NATURE CULTURE
میں فرق کرنا شروع کر دیا تاکہ ارتقا کے قوانین سے نجات حاصل کی جا سکے۔ ان کی تحریروں
نے میکس ویبر MAX WEBER کے سماجیاتی طریقہ کار کو تقویت پہنچائی جس کے
مطابق فرد کے افعال کو اس روشنی میں دیکھا جاتا ہے کہ سماج کے دوسرے افراد پر اس کا
کیا اثر پڑے گا یا ان کے لیے اس کی کیا اہمیت ہوگی اپنی ابتدائی تحریروں میں لوکاچ اس
مکتبِ فکر سے کافی متاثر نظر آتا ہے۔ اس نے رومانوی تحریک کا بھی اسی مکتبِ فکر کی روشنی
میں جائزہ لیا تھا۔ البتہ بعد کی تحریروں میں اس نے اس طریقہ کار کی اپنے زمانۂ جوانی کی
گمراہی کہہ کر مذمت کی اور اپنے اس فلسفے کو موضوعی تصوریت قرار دیا۔ دراصل عام طور پر
اس قسم کی فلسفیانہ موضوعیت کو نو کانٹین فلسفہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن صحیح معنی میں لوکاچ کبھی بھی
اس معنی میں نو کانٹین نہیں رہا۔ کانٹ ازلی حقیقت کے عرفان کا منکر تھا دوسرے لفظوں میں
ہم اسے لا ادری AGNOSTIC قرار دے سکتے ہیں۔ مگر لوکاچ شروع سے ہی اصطلاحی
معنی میں لا ادری نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کی ابتدائی تصنیف THE SOUL AND THE
FORMS سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوکاچ کم از کم جمالیات کے دائرہ میں وجدان
کے ذریعہ حقیقت کے عرفان کا قائل رہا تھا۔ دراصل لوکاچ کانٹ کی موضوعی تصوریت سے
زیادہ ہیگل کی خارجی تصوریت سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے ویسے تاریخی اعتبار سے یہ کہنا

زیادہ صحیح ہوگا کہ ہیگل کی طرف اس کا رجحان ہیڈلبرگ میں ایمل لاسک EMIL LASK کے زیر اثر بعد میں ہوا۔

لوچ نے ۱۹۱۱ میں اپنے ایک دوست LAJOS FULEP جو ایک فنی تاریخ کا ماہر تھا، کے ساتھ مل کر ایک رسالہ نکالا جس کا نام SZELLEM (SPIRIT) رکھا گیا تھا اس کے صرف دو شمارے ہی نکل سکے اور ان دونوں شماروں میں لوچ کے مضامین شامل تھے۔ اس کے بعد یہ رسالہ بند ہوگیا۔ اسی دوران لوچ کے بہترین دوست لیو پوپر کا ۲۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا لوکاچ پوپر کو آخر تک اپنا بہترین دوست شمار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی یادگار تصنیف جمالیات" کے صفحات بھی ۱۹۶۳ء میں اسی کے نام منسوب کیے لوکاچ اپنے اس دوست کے خیالات سے ابتدا ہی سے بہت متاثر ہو تھا۔ دراصل لوکاچ کی ابتدائی تصنیف (THE SOUL AND THE FORMS) کا پہلا باب THE ESSENCE AND FORM OF THE ESSAY ایک خط ہے جو اس نے اپنے دوست پوپر کو فلورنیس سے اکتوبر ۱۹۱۰ء میں لکھا تھا۔

لوکاچ ۱۹۱۱ سے ۱۹۱۲ تک برلن میں مقیم رہا مگر اس نے پھر فلورینس جا کر "جمالیات" پر اپنی کتاب کا خاکہ تیار کرنے کا ارادہ کر لیا اور فلورینس واپس لوٹ گیا۔ لوکاچ کی یہ "فلسفۂ تاریخ" اور "اخلاقیات" کے سلسلے کی پہلی ابتدائی تصنیف تھی لیکن جلد ہی لوکاچ اپنے فلسفی دوست ارنسٹ بلوخ کی رائے مان کر ۱۹۱۲ء میں ہی فلورنیس سے ہائیڈلبرگ واپس آگیا تاکہ وہ وہاں کے فلسفیانہ ماحول میں بہتر طور پر کام کر سکے۔ یہیں ۱۹۱۲ میں اس کی ملاقات ایمل لاسک اور میکس ویبر سے ہوئی اور وہ ان دونوں کا بہترین دوست بن گیا۔ بلوخ، لاسک اور ویبر تینوں جرمنی کے اہم دانشوروں نے "جمالیات" پر اپنا کام جاری رکھنے کے لیے لوکاچ کی ہمت افزائی کی۔ ۱۹۱۸ تک لوکاچ اپنے اس ضخیم مسودے پر کام کرتا رہا حالانکہ بیچ بیچ میں کئی مرتبہ وہ اس کتاب پر کام جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ بالآخر ۱۹۱۸ میں تسلی بخش طریقہ سے اپنا کام تمام نہ کرنے کی وجہ سے اس نے جمالیات پر اس مسودّے کو ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

۱۹۱۳-۱۴ میں لوکاچ نے ہائیڈلبرگ میں رہائش اختیار کی اور میکس ویبر کے دانشورانہ حلقے کا اہم رکن شمار ہونے لگا۔ اس زمانے میں ایمل لاسک ہائیڈلبرگ میں فلسفے کا استاد تھا اور لوکاچ اس سے کافی متاثر تھا۔ ایمل لاسک کے ہی زیر اثر لوکاچ میں نوفلاطونیت کی طرف جھکاؤ پیدا ہوا اور اسی کا منطقی نتیجہ مافوق الاحساس وجود میں یقین کی صورت میں ظاہر ہوا

لاسک خود ایک غیر معمولی مفکر اور بڑی گہری نظر رکھنے والا انسان تھا۔ لاسک ایڈمنڈ ہسرل - ELM-
UND HUSSERL - کی مظہریت کا قائل ہو چلا تھا اور دھیرے دھیرے اس کا نقطۂ نظر مابعد الطبیعاتی
ہو چلا تھا۔ ویسے اس دور کے دانش ورانہ رجحانات میں کوئی زبردست تبدیلی آنے کا امکان نظر
نہیں آتا تھا مگر ۱۹۱۴-۱۸ کی عالمی جنگ نے فکر و دانش کی دنیا میں زبردست ہلچل پیدا کر دی
اور فلسفے کے مسلم الثبوت نظریے ڈانواڈول ہونے لگے۔ ایسے حالات میں مکتبی اور پیشہ ورانہ
فلسفہ، جس نے علم کو مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا، اپنی وقعت کھونے لگا۔ ویبر جیسے مفکر
اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ اب مابعد الطبیعات کی طرف لوٹنا ممکن ہو چکا ہے۔ لیکن نوجوان
دانشوروں کا گروہ اب بھی خارجی دنیا سے متعلق "مکمل سچائی" کی تلاش میں سرگرداں تھا
یاد رہے کہ ایسا کوئی بھی نظام جو مکمل سچائی کا دعویدار ہو مابعد الطبیعاتی عناصر سے پاک نہیں
ہو سکتا، یہی وجہ تھی کہ فلسفیانہ میلان رکھنے والے کئی مفکر ایسے ہی نظام کی تلاش میں مذہب کی
طرف راغب ہو گیے یا چند لوگ نیٹشے کے غیر عقلی فلسفے کی طرح کھنچ گیے۔ اور کچھ لوگ تو
لاشیئیت NIHILISM کے زیر اثر انسان کے تہذیبی ورثے کے ہی منکر ہو گیے۔ لوکاچ چند
وجوہات کی بنا پر جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا ان فکری میلانات سے بچتا ہوا ہیگل کی طرف
راغب ہوا۔ لوکاچ دراصل ادبی نقاد تھا اور ادبی تنقید کے ذریعے فلسفے کی طرف آیا تھا ان دنوں
لوکاچ اسٹفن جورج نامی شاعر کے پوشیدہ حلقے میں شامل ہو گیا تھا اور یہ حلقہ سیاست کو بنیادی
طور غلط سمجھتا تھا اس حلقے میں زیادہ تر گوئٹے نیٹشے یا انیسویں صدی کے اواخر کے شعرا سے متاثر
یا تصوف کی طرف جھکاؤ رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ عام آدمی سے سخت متنفر تھے اور
نیٹشے کی طرح اشرافی قدروں کے حامل تھے۔ لوکاچ کی اس دور کی اہم تصنیف THEORY OF
THE NOVEL میں بھی ہمیں اسی رجحان کی زیریں لہر نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس کا مسودہ
۱۹۱۴-۱۵ میں تیار ہو چکا تھا، یہ کتابی شکل میں ۱۹۲۰ء میں ہی شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔

لوکاچ نے جس یاسیت کے عالم میں یہ تصنیف قلمبند کی اس کا اندازہ اس کتاب کے اس پیش لفظ
سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کرتے وقت ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا۔ اس
دور کی سیاسی دنیا میں کونسی امید باقی رہ گئی تھی؟ اس زمانے میں یہ یاسیت لوکاچ کو ہمیشہ قائم
رہنے والی لگ رہی تھی اور اسے ٹامس من کی طرح بورژوا لبرلزم اور مغرب کے زوال آمادہ معاشرہ
سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ ٹامس من تو اپنے دل سے جرمنی کی فتح کی خواہش رکھتا تھا، لوکاچ کو

جرمنی کی فتح سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اپنے اس پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ اسے اس یاسیت کا حل ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب میں بالآخر نظر آیا۔ اس انقلاب کی روشنی میں وہ سوالات جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا اسے حل ہوتے نظر آنے لگے۔ اس کو اپنے نظریاتی الجھاؤ کا عملی حل بھی اسی انقلاب میں نظر آیا اور اس کا مابعد الطبعیاتی کرب بھی اسی انقلاب نے دور کیا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لوکاچ کے لیے سویت روس کا انقلاب دوسرے کئی مفکروں اور دانشوروں کی طرح ایک زبردست ذہنی موڑ ثابت ہوا۔ اس ذہنی موڑ کا اندازہ ہمیں لوکاچ کے ۱۹۶۲ والے اس پیش لفظ سے اچھی طرح ہوجاتا ہے جو اس نے اپنی اس تصنیف کی دوبارہ اشاعت پر لکھا۔ اس انقلاب نے لوکاچ کو ذہنی طور پر ہمیشہ کے لیے دلتھی اور نوکانشین (NEO-KANTIAN) ثبوتیت کے اثرات سے آزاد کر دیا۔ انقلاب سے پہلے DILTHEY کا فلسفہ اور اس سے ملتے جلتے ذہنی رجحانات لوکاچ کو اس دور کا بڑا اہم اور عظیم الشان امتزاج نظر آتا تھا جو ذہنی دنیا میں ایک نئی نہیت کی نشان دہی کر رہے ہوں مگر انقلاب کے بعد یہ فلسفہ اسے غیر مستند اور غیر محفوظ بنیادوں پر ایستادہ نظر آنے لگا اب اسے یہ محض اس دور کے وقتی میلانات محسوس ہونے لگے۔

لوکاچ کو پھر بھی اپنی اس دور کی اس تصنیف کی چند باتیں عزیز تھیں۔ لوکاچ اس وقت تک ہیگل کے زیر اثر آچکا تھا اس کے خیال سے THEORY OF THE NOVEL پہلی تصنیف تھی جس میں ہیگل کے فلسفہ کی روشنی میں جمالیات کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ٹامس من نے بھی اس کی اس تصنیف کو بے حد سراہا اور جرمنی کے ادبی اور دانشورانہ حلقوں میں لوکاچ کا اپنا ایک اہم مقام بن گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی اس تصنیف میں کمزوریاں نہیں تھیں خود لوکاچ نے ۱۹۶۲ کے پیش لفظ میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس کے کئی تصورات دوسروں سے مستعار لئے گیے تھے اور اسے بالکل طبعزاد کہنا مشکل ہوگا۔ اسی طرح اس کی ۱۹۲۳ والی مشہور کتاب HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS بھی طبعزاد تصانیف کے زمرے میں شمار نہیں کی جاسکتی۔ اس فلسفیانہ تصورات پر کلاسک کے KANTIAN فلسفے کی تعبیر، فختے اور ہیگل کا اثر اور اس کے سیاسی اور معاشی تصورات پر روزا لگزبرگ اور لینن کا اثر صاف ظاہر ہے

اسی زمانے میں لوکاچ کی ملاقات بیلینا اندریونا گرابینکو، جو روس کی ایک سماجی انقلابی پارٹی کی رکن تھی، سے ہوئی اور اس نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنی کتاب

THE THEORY OF THE NOVEL اسی کے نام منسوب کی ہے۔ گرابینکو لوکاچ کی پہلی بیوی تھی۔ اس کے ماں باپ اس شادی کے مخالف تھے کیونکہ اس لڑکی کا تعلق اونچے خاندان سے نہیں تھا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ میکس ویبر نے لوکاچ کو اس موقع پر یہ مشورہ دیا کہ وہ اس لڑکی کو اپنے ماں باپ کے سامنے اس کا (یعنی میکس ویبر کا) رشتے دار بنائے اور چونکہ میکس ویبر کا بہت اونچے خاندان سے تعلق تھا اس لیے لوکاچ کے والدین نے چارو ناچار اس شادی کی اجازت دے دی لیکن بہت جلد یہ ازدواجی رشتہ ناکام ثابت ہو گیا۔ گرابینکو ہائیڈلبرگ میں ہی مقیم رہی جب کہ لوکاچ بوڈاپیسٹ واپس لوٹ گیا اور آخر ۱۹۱۹ء میں دونوں ایک دوسرے سے قانونی طور پر الگ ہو گیے۔

اب جنگ چھڑ چکی تھی اور ہر صحت مند شہری کے لیے فوج میں بھرتی لازمی قرار دے دی گئی تھی مگر لوکاچ کے والد اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اپنے بیٹے کو محاذ جنگ پر جانے سے بچا لیتے ہیں اور اس کی جگہ پر اسے سینسر کے آفس میں کام مل جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں لوکاچ کو اکثر کئی کئی مہینے تک ہائیڈلبرگ میں رہنا پڑتا تھا۔ اسی زمانے میں وہ ہائیڈلبرگ میں دانشوروں کے ایک گروہ سے متعلق ہو گیا جو مجلس یک شنبہ SUNDAY CIRCLE کے نام سے مشہور تھا اور بڑے بڑے نامور ادیب و دانشور اس کے مذاکروں میں شرکت کرتے تھے اس کی طرف سے کئی عام جلسے بھی ہوا کرتے تھے اور نفسیاتی علوم کے آزاد مکتب کے FREE SCHOOL OF THE SCIENCES OF THE SPIRIT کے ڈھانچے میں رہ کر بڑی معرکۃ آلارا تقریریں بھی رکھی جاتی تھیں۔ ۱۹۱۷ء میں ہی لوکاچ نے جمالیات پر اپنی تصنیف کا پہلا باب مکمل کیا جس کا نام "جمالیات میں موضوع اور معروض کے رشتے" رکھا گیا اور یہ جرمن اور ہنگیری دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔

ابھی تک لوکاچ اور میکس ویبر کے تعلقات خوشگوار تھے لوکاچ ویسے ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب سے بہت متاثر تھا حالانکہ ابھی تک اس کے فلسفیانہ نظریات میں بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی ۱۹۱۸ء میں میکس ویبر بوڈاپیسٹ میں لوکاچ کے ساتھ ہی مقیم رہا اور عام طور پر وہ فلسفے اور جمالیات کے علاوہ مارکسزم اور سوشلزم کے موضوع پر بحث کرتے رہتے تھے لیکن کچھ تناؤ کے باوجود ان کے تعلقات میں ہم آہنگی قائم رہی لیکن ۱۹۱۹ء کے واقعات نے ان میں آپس میں ناقابل عبور خلیج پیدا کر دی۔ لوکاچ نے ویسے تو ۱۹۰۲ء میں جو اس کی نوعمری کا زمانہ تھا مارکسزم کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا تھا۔ اس نے اس وقت ایک سوشلسٹ طالب علموں کی تنظیم میں بھی رکنیت حاصل کی تھی

اور ۱۹۱۱-۱۹۰۶ء کے درمیانی عرصے میں سوشیالوجی آف لٹریچر کے ضمن میں بھی مارکس کی تحریروں کا براہ راست یا سمل، میکس ویبر وغیرہ کی تحریروں کے ذریعے مطالعہ کیا تھا۔ ہیگل کو بھی پڑھتے وقت ۱۹۱۵-۱۹۱۲ء کے درمیاں مارکس کو پڑھا تھا اور ۱۹۱۲ء میں تو اس نے یہ کہا تھا کہ ہیگل کو ٹھیک سے سمجھنے کے لیے مارکس کو پڑھنا بہت ضروری ہے۔ لیکن عالمی جنگ اور خاص طور سے روسی انقلاب کے بعد لوکاچ کو مارکسزم کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور آخر کار اس نے سیاسی اور فلسفیانہ دونوں اعتبار سے مارکسی نظریہ قبول کرلیا اور مرتے دم تک اس نظرئے کا قائل رہا۔ لوکاچ نے ۲ دسمبر ۱۹۱۸ء میں باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی جوائن کرلی جو بوڈاپیسٹ میں اس سے بارہ دن پیشتر ہی قائم کی گئی تھی۔ جب لوکاچ نے کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کی، اس کی ممبر شپ کی تعداد سو سے بھی کم تھی۔ کمیونسٹ تحریک میں شامل ہوتے ہی اس پر فرقہ باز SECTERIAN قسم کے کمیونسٹوں کی طرف سے حملے شروع ہو گیے۔

پارٹی میں شمولیت کے چند ہفتوں بعد ہی JOZSEK REVAI نے لوکاچ پر نظریاتی حملہ کرتے ہوئے اسے بورژوا دانشور قرار دیا اور اسے پارٹی سے نکالے جانے کی مانگ کی لیکن جوزیف ریوائی کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لوکاچ پر "دقیانوسی خیالات" کا حامل ہونے کا الزام لگایا گیا تھا اور اس کا ثبوت یہ پیش کیا گیا تھا کہ اس نے یونانی کلاسیکی ادب بہت پسند کیا تھا۔ اس کے جواب میں لوکاچ نے مارکس کی مشہور تصنیف THE CRITIQUE OF POLI-TICAL ECONOMY سے مارکس کا یہ مقولہ پیش کیا "ہومر کی تخلیقی ادب میں نظیر ملنا مشکل ہے" اس بات لوکاچ کی جوزیف ریوائی سے کافی بحث ہوئی اور آخر جیت لوکاچ کی ہوئی۔ اس تنازعے کے بعد لوکاچ اور جوزیف ریوائی میں گہری دوستی ہو گئی جو کئی اتار چڑھاؤ کے باوجود ۴۰ سال تک قائم رہی۔ حالانکہ لوکاچ کے والد اپنے بیٹے کے انقلابی خیالوں سے اور آسٹریا۔ہنگیری سامراج کے زوال سے بے حد پریشان ہوئے مگر اس کے باوجود ہر طرح اپنے بیٹے کی ہر ممکنہ مدد کرتے رہے۔ لوکاچ پارٹی میں ترقی کر کے قائم مقام مرکزی کمیٹی کا ممبر بن گیا اور جب مرکزی کمیٹی کے تمام اراکین گرفتار کر لیے گیے تو قائم مقام مرکزی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے اسے بڑے اہم فرائض انجام دینا پڑے۔ اس کے بعد مارچ میں جب ہنگری کی سوویت کا اعلان ہوا تو لوکاچ کا تقرر محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی منسٹر DEPUTY PEOPLE'S COMMISSAR کی حیثیت سے ہوا اور بعد میں محکمۂ تعلیم ہی میں وزارت کا ہیڈ مقرر کیا گیا۔

لوکاچ نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے تہذیبی میدان میں اقدامات کیے اور "تاریخی مادیت" کی تحقیق و ترقی کے لیے ایک اعلیٰ پائے کا ادارہ قائم کیا۔ اس کا لیکچر THE CHANGING FUNCTION OF HISTORICAL MATERIALISM جو اس کی متنازعہ مگر معرکتہ الآرا تصنیف HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS میں شامل کیا گیا ہے اسی ادارہ کے افتتاح کے وقت لکھا گیا تھا۔ بعد میں دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے جو فوج ترتیب دی گئی اس میں لوکاچ پانچویں ڈویژن کا سیاسی کمیسار مقرر کیا گیا کمیون کی شکست و ریخت کے بعد لوکاچ کے اکثر سیاسی دوست ملک سے پوشیدہ طور پر چلے گئے مگر وہ خود روپوش ہو کر غیر قانونی طور پر پارٹی کا کام کرتا رہا KORVIN OHO جسے ۱۹۲۰ء میں ہنگری کی انقلاب دشمن حکومت نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لوکاچ کے ساتھ کام کرتا رہا۔ لوکاچ او ٹو کورون کو درویش صفت اور انقلابی ہیرو کہتا تھا اور سے مثال کے طور پر پیش کیا کرتا تھا۔ لوکاچ کئی دنوں تک ایک فوٹوگرافر OLGA MATE کے گھر پوشیدہ رہا اور آخر لوکاچ کے والد نے اپنے ایک قریبی دوست کے ذریعے ایک انگریز افسر کو موٹی رقم رشوت دے کر (جس کے لیے اسے قرض بھی لینا پڑا) لوکاچ کو اپنے شوفر کے بھیس میں ہنگری سے باہر لے گیے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوکاچ کو کار چلانا قطعاً نہیں آتا تھا۔ لوکاچ ویانا میں اکتوبر میں پھر گرفتار لیا گیا اور ہورتھی حکومت نے اسے اپنی تحویل میں لے نے کی مانگ کی ہورتھی حکومت اسے اس کی غیر موجودگی میں سزائے موت دے چکی تھی۔

اس مرتبہ دانشوروں کے ایک حلقے نے اسٹرین حکومت سے لوکاچ کو بچانے کی سفارش کی اور ۱۲ نومبر کے BERLINER TAGEBLATT میں اس سے متعلق اپیل شائع کی۔ اس اپیل پر دستخط کرنے والوں میں اوروں کے علاوہ ٹامس من بھی شریک تھا۔ اس اپیل کا یہ اثر ہوا کہ ہنگری حکومت کی لوکاچ کو اپنی تحویل میں لینے کی درخواست نامنظور کر دی گئی اور دسمبر کے آخر میں لوکاچ کو رہا کر دیا گیا۔ رہا ہو کر لوکاچ نے ۱۹۲۰ء میں اپنی نوجوانی کی محبوبہ GERTRUD BORTSTIEBER سے شادی کر لی یہ لوچ سے عمر میں ۳ سال بڑی تھی اور ۱۹۰۲ء سے اس کے گھر اس کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ لوچ اسے اسی وقت سے چاہنے لگا تھا مگر گرٹروڈ نے لوکاچ سے دلچسپی نہ لیتے ہوئے ایک علم ہندسہ کے ماہر سے شادی کر لی جو چند سال کے بعد ٹی۔ بی کے عارضے میں مرگیا۔ گرٹروڈ ۱۹-۱۹۱۸ سے لوکاچ سے محبت کرنے لگی اور ۱۹۲۰ء میں دونوں نے ویانا میں شادی کر لی۔ گرٹروڈ کے پہلے شوہر سے دو بیٹے تھے اور لوکاچ سے ایک لڑکی پیدا

ہوئی لوکاچ اور گرٹروڈ کو ان تینوں بچوں کی پرورش میں اکثر و بیشتر بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ گرٹروڈ ایک تربیت یافتہ ماہر معاشیات تھی اور ادب اور موسیقی سے گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ اس میں عملی دانشمندی، حقیقت کا احساس اور پرسکون مزاج کے ساتھ محبت سے گرما دینے والے کردار جیسی انمول صفات تھیں۔ یہ شادی بہت کامیاب رہی گرٹروڈ بورسیٹیر کے بغیر لوکاچ کی عظیم تصنیفات جیسے کہ HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

لوکاچ نے پارٹی کے کام میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی اور جلد ہی لینڈلیر گرٹ کا ڈپٹی لیڈر بن گیا۔ لوکاچ بائیں بازو کی انتہا پسندانہ لائن اختیار کرتا ہے اور اسی لیے لینن نے پارلیمانی سیاست سے متعلق اس کے مضمون کی تنقید کی جو ۱۹۲۰ء میں KOMMUNISMUS میں شائع ہوا تھا۔ ویانا میں بھی لوکاچ پوری طرح محفوظ نہیں تھا کیونکہ ہورتھی حکومت کے خفیہ ایجنٹ ہنگری کے مہاجر دانشوروں کو دھوکے سے پکڑ کر سرحد پار ہنگری بھگا کر لیجاتے تھے اور وہاں انھیں کڑی سزائیں دی جاتی تھیں۔ لوکاچ کو بھی اس بات سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی گئی اور اس نے اپنی حفاظت کے لیے پستول خرید لیا یہ پستول اس کے پاس ۱۹۳۳ تک رہی جب نازیوں نے اس کے گھر کی تلاشی لی اس وقت خوف سے اس نے اسے دریائے اسپری میں پھینک دیا ویسے لوکاچ کے خلاف مضحکہ خیز الزام لگایا گیا تھا کہ کمیون کے دنوں میں اس نے دانشوروں میں دہشت پھیلا رکھی تھی اور ان کے سینوں پر بندوق کی نالی رکھ کر ان سے سوالات پوچھا کرتا تھا دراصل لوکاچ نے اپنی زندگی میں کبھی اس پستول کے سوا کسی ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے دوسری جنوب مشرقی کمیونسٹ یوتھ انٹرنیشنل کانفرنس جو ویانا میں منعقد ہوئی تھی، میں عالمی رجعت پرست طاقتوں اور عالمی انقلاب پر ایک رپورٹ پیش کی جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ ۲۱-۱۹۲۰ء میں لوکاچ کامنٹرن کے اہم نظریاتی رسالے KOMMUNISMUS کا معاون مدیر مقرر ہوا۔ اس رسالے میں اس نے کئی اہم مضامین شائع کیے جو بعد میں HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS میں شامل کیے گئے۔

دوسرا باب

کسی ایسے دانشور کی زندگی کو جس نے اپنے عہد کی زبردست انقلابی جدوجہد میں برسوں حصہ لیا ہو ذاتی اور عوامی زندگی کے خانوں میں بانٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لوکاچ بھی اس معنیٰ میں ایک غیر معمولی دانشور تھا جو نہ صرف ایک انقلابی مفکر تھا بلکہ انقلابی تحریک سے عملی طور پر پوری طرح وابستہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود کوشش کے ہم اس کی زندگی کو ذاتی اور عوامی زندگی کے خانوں میں تقسیم مشکل ہی سے کر سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ ہم چند ایسے واقعات کا ذکر کر سکتے ہیں جس کا تعلق خاص طور سے اس کی نجی یا خاندانی زندگی سے رہا ہو۔ دراصل دوسرے عملی انقلابیوں کی طرح لوکاچ کی سوانح حیات بھی اس کے دور کے عہد ساز انقلاب کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس لیے ہم لوکاچ کے سوانح حیات کو بھی اس کے عہد کے اہم واقعات کے ساتھ ساتھ ہی پیش کریں گے۔ بیسویں صدی کے پہلے دور سے جو لوکاچ کی فکری اور علمی اٹھان کا زمانہ ہے یورپ کے لیے بڑی اتھل پتھل کے دہے گذرے ہیں۔ ویسے چوتھے دہے میں جب ہٹلر نے جرمنی میں اقتدار پر قبضہ کیا، یورپ پر کم قیامت نہیں گذری، مگر بیسویں صدی کے پہلے دو دہے عالمی جنگ اور روسی انقلاب کی وجہ سے بڑے اہم اور عہد ساز ہیں۔ لوکاچ یورپ کے اسی ماحول میں پروان چڑھا۔

لوکاچ سے متعلق یہاں چند باتوں کی وضاحت ضروری ہے جس کی طرف جورج لشتھائم نے بھی لوکاچ پر اپنی کتاب کے دوسرے باب میں اشارہ کیا ہے۔ لوکاچ کے فکری نتائج کا مطالعہ کرتے وقت ایک مشکل جو درپیش ہوئی ہے وہ براعظم یورپ میں لوکاچ کی ایک نظریہ ساز کی حیثیت سے قبولیت اور انگریزی زبان کی دنیا میں (جس میں برطانیہ اور امریکہ شامل ہیں)

اس کی اہمیت جس طرح تسلیم کی جاتی ہے اس کا فرق ہے۔ لوکاچ کے بعض کوتاہ نظر مداح اور چند نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر جمالیات کا نظریاتی ماہر تھا اور کمیونسٹ پارٹی میں اس کی شرکت محض چند ذاتی حادثاتی واقعات کا نتیجہ تھی۔ لوکاچ کے متعلق اس قسم کا غلط تصور پیدا ہونے کی بنیادی وجہ اس نظریاتی رجحان کو سمجھنے میں ناکامی۔ ۔ ۔ ہے جو براعظم یورپ کے فکری میلانات کے پس منظر میں رہا ہے۔ یہ نظریہ کہ ادب اور فن کی اہمیت محض ازلی سچائیوں اور مطلق اقدار کی وجہ سے ہے کئی ملکوں کے سیاسی اور مذہبی اعتبار سے دقیانوسی خیالات کے حامل لوگوں میں مشترک رہا ہے۔ مگر اب ایسے نظریے کے حامی بھی عام طور پر دفاعی موقف ہی اختیار کرتے ہیں۔ اب زیادہ تر ادیب، دانشور اور فن کار چاہے وہ تجربیت کے حامی ہوں یا تاثریت IMPRESSIONISM کے، ادب اور فن کو ازلی اور معروضی سچائیوں کا حامل قرار دینے کے منکر ہیں۔ ہم آگے چل کر بھی لوکاچ کے فنی نظریات سے بحث کرتے ہوئے اس بات پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ تجربیت EMPIRIISM کے حامی جو اکثر سیاست میں لبرل اور اخلاقیات میں موضوعیت کے قائل ہوتے ہیں، یہ مانتے ہیں کہ فن بذات خود اپنا جواز رکھتا ہے اور جمالیات فن کی خود مختاری کا بیانیہ تجزیہ ہے ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ لوکاچ ایسے فنی نظریات کو بغیر تنقید کے قبول نہیں کرتا۔

لوکاچ کا فکر اور نظریاتی اٹھان جرمنی میں ہوا تھا جو یورپ کے براعظم کے فلسفیانہ نقشے پر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جرمنی کی اپنی مابعد الطبعیاتی فلسفیانہ روایات اور یہاں کانٹ اور ہیگل جیسے دیو قامت فلسفی اور ان کے فلسفیانہ نظام پیدا ہوئے۔ یوں بھی یورپ کے براعظم کے ممالک، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، انگریزی زبان بولنے والی دنیا کے ممالک سے فلسفیانہ اور تہذیبی روایات میں اپنے آپکو ہر اعتبار سے برتر تصور کرتے آئے ہیں۔ دراصل ان ممالک نے عام طور پر، اور جرمنی نے خاص طور پر انگریزی دنیا کے صنعتی دور کی پیداوار تجربیت کو کبھی قبول نہیں کیا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فرانس اور جرمنی میں صنعتی انقلاب برطانیہ کے مقابلہ میں دیر سے آیا اور ان ممالک میں فیوڈل دور کے پیداوار مابعد الطبعیاتی فلسفیانہ نظام مقبولیت عام کی سند حاصل کرتے رہے۔ مارکسزم پر بھی (مارکس آخر کار جرمنی کی فلسفیانہ اور عقلی روایات میں پروان چڑھا تھا)، جو صنعتی دور کی اقدار کا حامل فلسفہ، ہیگل کے فلسفیانہ نظام کی وہ چاہے معکوس شکل میں ہی کیوں نہ ہو، گہری چھاپ ہے۔ مارکسزم میرے خیال سے

محض سائنٹفک نظام ہی نہیں اس میں مابعد الطبیعاتی عناصر بھی شامل ہیں۔ جدلیاتی مادیت بہر حال ایک فلسفیانہ موقف ہے، ناقابل تردید سائنٹفک تصور نہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یورپ کے براعظم کے ممالک اور خاص طور سے جرمنی انگلش تجربیت کو فلسفیانہ اعتبار سے تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دراصل ایک رائج جارگن میں اینگلو۔ امریکی ممالک کو غیر مرکوز کلیت DE-CENTRED TOTALITY کہا گیا ہے۔ ان کے نزدیک انگلش کلچر کمتر درجے کا ایسا نظام ہے جس کا کوئی مرکز نہیں۔ نہ اس کا کوئی صحیح معنیٰ میں فلسفہ ہی ہے۔ اس کلچر میں زندگی کی کلیت یا کسی ہمہ گیر نظام عقلی کا کوئی تصور ہی نہیں۔ تجربیت ہر شئے کو چھوٹی وحدتوں یا جزیں تقسیم کر دیتی ہے۔ اور اس طرح اس کی کلیت مجروح ہو جاتی ہے۔ اس کی مدد سے چند حقیقتوں کو سمجھنے میں بھلے ہی مدد ملے مگر کلی تناظر میں کوئی باقاعدہ نظریہ قائم نہیں رہ سکتا اس لیے انگریزی بولنے والی دنیا میں جسے فلسفہ کہا جاتا ہے۔ وہ منطقی تجزیے کی ایک دلچسپ مشق سے زیادہ کچھ نہیں۔ (براعظم کے بعض فلسفی تو اسے محض مکتبی کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ امریکہ اور انگلینڈ کے تجربیت کے حامی فلسفی اس نظریئے کے رد عمل میں مابعد الطبیعاتی فلسفے کو دور کہن کا افسانہ قرار دیتے ہوئے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہیگل کا فلسفہ ان کے نزدیک ایک فراڈ اور مارکسزم اس کی ناجائز اولاد ہے۔

لوکاچ کی ذہنی اٹھان براعظم یورپ کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کے اور انگریزی بولنے والی دنیا کے درمیان ایک قسم کی ذہنی خلیج حائل ہے۔ اس لیے کسی نہ کسی مرحلے پر اس خلیج کو پاٹنا بے حد ضروری ہے۔ جو براعظم یورپ کے لیے عام سچائی سمجھی جاتی ہے وہ اس دنیا میں وضاحت کی محتاج ہے۔ جرمنی وغیرہ ممالک میں یہ بات عام رہی ہے۔ کہ سائنس مابعد الطبیعاتی نظام کی جگہ نہیں لے سکتا لیکن انگلش ذہن اپنے مختلف ذہنی پس منظر کی وجہ سے اس بات کو اتنی آسانی سے ہضم نہیں کر سکتا۔ ان کے نزدیک تو مابعد الطبیعات منطقی یا لسانی تجزیئے سے بدرجہا بہتر ہے اور حقیقت کو اول الذکر کی مدد سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس بات کا ایک اور منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لٹریچر یا فن بھی فلسفے کی جگہ نہیں لے سکتا۔ فلسفہ ایک ہمہ گیر اور کلی نظام TOTALIZING ہے جب کہ ادب، فن، سائنس وغیرہ اس کے کچھ پہلو اس معنیٰ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادبی اور فنی نظریات ہیگل اور مارکس کے کلیاتی نظام فلسفے کا TOTALIZING PHILOSOPHY کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ لوکاچ بھی

محض ادب کے ہاتھی دانت مینار سے نکل کر فلسفے کی دنیا میں داخل ہوا۔ لوکاچ یہ سمجھ چکا تھا کہ ادب مذہب اور فلسفے کی جگہ نہیں لے سکتا حالانکہ وہ ان دونوں کی اقدار کی ترسیل کا بہترین ذریعہ ہے۔

آج ہمارے سامنے ادب اور جمالیات سے ہٹ کر بھی لوکاچ کی اہم تصنیفات ہیں۔ "تاریخ اور طبقاتی شعور" ان میں خاص اہمیت رکھتی ہے اور اس کتاب کا ہم اوپر بھی ذکر کر چکے ہیں۔ لوکاچ نے دراصل ۱۹۲۴ کے بعد ہی لینن ازم کو بغیر کسی ذہنی تحفظات کے قبول کیا اس سے پہلے لوکاچ سیاسی اور تاریخی معاملات میں ذاتی موقف اختیار کر رہا تھا۔ جو لینن ازم سے مختلف تھا۔ سیاسی معاملات میں تو اس نے بائیں بازو کی انتہا پسندانہ سیاسی موقف کو اختیار کیا۔ اس لیے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی کہ ۱۹۲۴ میں لوکاچ اپنی سیاسی سمجھ بوجھ اور اسٹریٹیجی کے اعتبار سے پہلے والے لوکاچ سے بہت مختلف تھا۔ لوکاچ کی لینن سے پہلی ملاقات ماسکو میں ۲۱-۱۹۲۰ میں کامنٹرن کے تیسرے اجلاس کے درمیان ہوئی۔ لوکاچ لینن کی اپنی اس ملاقات کو اپنی زندگی کا تشکیلی تجربہ کہتا ہے۔ لوکاچ کے سیاسی نظریات میں ہمیں ایک حد تک ثنویت نظر آتی ہے۔ جہاں تک عالمی انقلاب کا سوال ہے لوکاچ نے بڑا ہی غلط رویہ اختیار کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے تاریخی اور فلسفیانہ نظریات تھے جس کی ترجمانی تاریخ اور طبقاتی شعور میں کی گئی ہے۔ اس کتاب کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ لوکاچ نے اوروں سے ہٹ کر مارکس اور لینن کی تصانیف کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لوکاچ سیاسی اور دوسرے اعتبار سے لینن سے قریب ہی اس کی موت کے بعد ہی آیا لینن کی موت کے وقت لوکاچ کامنٹرن کا ممبر بن چکا تھا اور لینن پر اسے کامنٹرن کے ایک ذمہ دار رکن کی حیثیت سے ہی لکھنا پڑا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۹۲۴ کے بعد سیاسی موقف کے اعتبار سے لوکاچ میں بنیادی تبدیلی آگئی اور اب وہ پوری طرح لینن کے سیاسی نظریات کا حامی ہو گیا۔ البتہ اس کا فلسفیانہ موقف اب بھی ۱۹۱۴ کے آس پاس کے نظریات کے اثرات لیے ہوئے تھا۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا بر اعظم یورپ کا فلسفہ برطانیہ کے برخلاف بنیادی طور پر مابعد الطبعیاتی تھا اور لوکاچ تو ہیگل کے نظریات سے خاصا متاثر تھا اس لیے اس نے تجربیت کو کبھی بھی پوری طرح قبول نہیں کیا اس لیے انسانی اور عالمی قسمت سے متعلق اس کے چند عمومی مفروضات ہمیشہ غیر تجربی مابعد الطبعیاتی رنگ لیے ہوئے رہے۔ یہ مفروضات لوکاچ کے لیے

ایک حد تک قطعی سچائی کے حامل تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لوکاچ نے ان نظریات کو غیر عقلی عقیدے IRRATIONAL FAITH کے طور پر تسلیم کر لیا تھا؟ میرے خیال سے یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان مفروضات کی صحت یا سچائی سائنس کے ذریعے اثبوتیتی مفہوم میں ثابت نہیں کی جا سکتی مگر اسے غیر عقلی بنیادوں پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل ان کا تعلق حقیقت کی نوعیت کو وجدان اور دروں بینی سے سمجھنے یا عرفان حاصل کرنے سے ہے اور ہیگل کا فلسفہ اس کا بہترین ماڈل مہیا کرتا ہے یہ بات یہاں دلچسپی کا باعث ہو گی کہ اقبال بھی جرمن اور فرانچے فلسفیوں سے متاثر ہو کر کچھ اس قسم کے نتیجے پر پہنچے تھے اور اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید والے خطبات میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے ویسے یہ بات بھی یہاں ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اس موقف اور غیر عقلیت کے درمیان خط فاصل بڑا باریک ہے اور ذرا سی لغزش بھی غیر عقلیت کی طرف راغب کر سکتی ہے۔ اقبال کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا۔ انہوں نے برگساں وغیرہ جیسے فلسفیوں کے اثر کے تحت حقیقت کو قطعی طور پر روحانی تسلیم کر لیا۔ ان کے نزدیک قوت نمو یا ارتقا حیاتیاتی اور پراسرار قوت ہے نہ کہ مادی حرکت کا نتیجہ۔ روحانیت کے اثر کے تحت اقبال وجدان کو اکھری حقیقت سمجھ لیتے ہیں اور ہیگل اور برگساں سے آگے بڑھ نہیں پاتے جب کہ لوکاچ ہیگل کا اثر قبول کرتے ہوئے بھی وجدان اور دروں بینی کو اکھری حقیقت میں تبدیل کرنے کے بجائے مارکسزم اور اس کے مادی جدلیات والے فلسفے کو قبول کر لیتا ہے اور اس طرح حقیقت کی فلسفیانہ ماہیت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ پاتا ہے۔ ہم یہاں اقبال اور لوکاچ کا فن کار کی حیثیت سے نہیں بلکہ مفکر کی حیثیت سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اقبال کی فن کارانہ حیثیت مسلم رہتی ہے

لوکاچ کا ذہنی پس منظر سمجھنے کے لیے ہمیں اس دور کے یورپ میں پائے جانے والے فلسفیانہ تنازعات پر کچھ اور روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ براعظم یوروپ میں ہیگل اور نیٹشے سے متاثر دانشوروں کے لیے وہ چاہے HEIDEGGER ہو یا SPENGLER تجربیت اور اس سے پیدا ہونے والی عام سمجھ ان کے لیے ہر حال میں ناقابل قبول بات تھی۔ اسی معنی میں وہ NEO-KANTIAN ثبوتیت POSITIVISM کو بھی رد کرتے تھے۔ اور سائنس کی بنیاد ہی ثبوتیت اور تجربیت پر تھی۔ بشریاتی علوم HUMANITIES میں زبردست بحران کے باوجود فطری علوم NATURAL SCIENCES میں ثبوتیت کو مرکزی جزو کی

حیثیت حاصل تھی۔ جرمنی میں ایسے با اثر دانشور بھی موجود تھے۔ جن میں ہم میکس ویبر کا بھی شمار کر سکتے ہیں۔ جو نو کانٹین نظریات پر جو سائنٹفک دلائل اور مابعد الطبعیات کے درمیان خط فاصل کی حیثیت رکھتے تھے، ثابت قدم تھے۔ بعض سیاسی جماعتوں پر بھی نو کانٹین نظریات کا جرمنی اور اسٹریا میں اثر تھا جن میں سوشل ڈیموکریٹس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ۱۹۱۸ء تک نو کانٹین نظریہ اور ثبوتیت پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے اور اس کی پوزیشن کمزور پڑتی جا رہی تھی

لوکاچ نے انقلابی طاقتوں کا ساتھ دیکر ایک ایسا سیاسی کمٹ منٹ کیا تھا جو اس کے فلسفیانہ موقف سے میل کھاتا تھا اور جس کی وہ روسی انقلاب سے بہت پہلے سے تلاش میں تھا۔ لوکاچ اس زمانے میں منظر عام پر آیا جب وسطی یورپ میں صرف دو فلسفیانہ مکتبوں کے درمیان انتخاب کرنا پڑتا تھا تجربی ثبوتیت والا مکتب یا حیاتیت VITALISM یا فلسفۂ حیات LEBENSPHILOSOPHIC والا اسکول۔ ان دو مکتبوں کے درمیان یہ انتخاب ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا جو مذہب یا روایتی مابعد الطبعیات کے منکر ہو چکے تھے تجربیت کا تعلق انگریزی بولنے والوں کی دنیا سے تھا اور غیر عقلی حیاتیت کا تعلق نیٹشے اور برگساں وغیرہ سے لیکن علمی دنیا میں دو اسکولوں کے درمیان محدود انتخاب کی وجہ سے ذہنی بے چینی پائی جاتی تھی اسی لیے جب دلتھی نے روحانی سائنس SCIENCE OF SPIRIT جسے جرمن زبان میں GEIS-TESWISSENSCHAFT کہا گیا تھا، والا نظریہ پیش کیا تو جرمن دانشوروں کو اس سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی اور کئی لوگ اس کی طرف کھنچ گیے دراصل غور سے دیکھا جائے تو دلتھی کے اس نئے فلسفے میں کوئی بہت ہی بنیادی طور پر مختلف بات نہیں تھی۔ دلتھی کی اسپرٹ آف سائنس مفکر کے ذہن اور عالمی ذہن جس کے مظاہر کائنات کی تاریخ میں ہمارے سامنے بکھرے پڑے ہیں، میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس طرح دلتھی کی نئی تعبیر فلسفے کو وہی مرکزی اہمیت دینا چاہتی تھی جو ہیگل کے دور میں اسے حاصل تھی۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ دلتھی نے اپنے نیو کانٹین ذہنی پس منظر کے تحت (دلتھی پہلے نو کانٹین رہ چکا تھا، ہیگل کے روحانی علم الوجود SPIRITUALIST ONTORGIY کو فلسفے کی اس مرکزی حیثیت میں کوئی جگہ دینا نہیں چاہتا تھا۔

نیچرل سائنس اور دلتھی کے پیش کردہ سائنس میں مقصد اور طریقہ کار دونوں کا فرق تھا

طبیعاتی علوم موضوع اور معروض میں فرق کرتے ہیں، مادے اور ذہن میں امتیاز کرتے ہیں لیکن دلتھی کے یہاں داخلی مشاہدے اور دروں بینی پر زور تھا اور اس کا موضوع انسانی روح سے پیدا کی ہوئی کائنات تھی۔ ایک ایسا علم جو روح کا آئینہ دار بھی تھا اور انسانی ارتقا کی دستاویز بھی۔
دراصل بنیادی طور پر یہ ہیگل کے فلسفے کا ہی موقف تھا۔ ہیگل نے بھی مابعد الطبیعاتی عناصر کو مدغم کر کے ایک شاندار فلسفیانہ نظام تیار کر لیا تھا جو اپنے دور میں کافی مقبول رہ چکا تھا۔ مگر انیسویں صدی کے اواخر میں ثبوتیت کے حامیوں نے اس پر پے در پے حملے کیے۔ ان حملہ کرنے والوں میں، مورخ ماہرین سماجیات، ماہرین علم البشر، وغیرہ سبھی شامل تھے۔ جب فلسفے کو اہمیت دی گئی تو اس شرط پر کہ فلسفہ سائنس سے مختلف علمی دعوؤں یا اپنی برتری کا اعلان نہیں کرے گا۔ سائنس اور فلسفے کے اس مناقشے میں ثبوتیتی مارکسی مفکروں (جس میں اینگلس بھی شامل ہے) کا بھی یہی موقف تھا اس مکتب فکر میں سائنس کو فلسفے پر برتری حاصل تھی۔ لیکن دلتھی نے ایک بار پھر فلسفے کو اس کا کھویا ہوا اقتدار واپس دلانے کی کوشش کی۔ اس نے ہیگل کے فلسفے کو نئی شکل میں دوبارہ زندہ کیا۔
اس کی ساری کوششیں اس بات پر مرکوز تھیں کہ نظریے اور عمل میں منطق اور اخلاقیات میں، تجربیت اور ماورائیت میں ہم آہنگی پیدا کی جائے جسے کانٹ کے فلسفے نے پارہ پارہ کر دیا تھا دلتھی کا سارا زور انسان کے تاریخی تجربات کی کلیت پر تھا مورخ نہ صرف ماضی کا بیان کرتا ہے بلکہ وہ گذشتہ نسلوں کے تجربات کا تاثر اپنے ذہن میں دوبارہ پیدا کرتا ہے اور انھیں موجودہ نسل کے تجربات کے ساتھ مدغم کرتا ہے اور اس طرح انسانی تجربات میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔

لوکاچ کی اٹھان، دلتھی کے برخلاف، مذہبی ماحول میں نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اسے اپنے وجودی اضطرار EXISTENTIAL DESPAIR کا حل کسی مذہبی عقیدے میں نہیں مل سکتا تھا دلتھی نے پہلے تو کانشین ثبوتیت کا سہارا لے کر زندگی کے معنی تلاش کیے اور تسلی نہ ہونے پر مابعد الطبیعات کی طرف رجوع کیا اور GEISTESWISSENSCHAFT یعنی روح کے سائنس کا تصور پیش کیا۔ لوچ اس طرف جمالیات اور فن کے راستے سے آیا۔ لیکن جمالیات کو اس نے محض تفریح طبع کے لیے نہیں بلکہ فن کے ذریعے زندگی کا عرفان حاصل کرنے کی غرض سے اختیار کیا ۱۹۱۲ میں ہی اس کی جوان عمری کی تصنیف THE SOUL AND THE FORM پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نقاد نے لکھا تھا: شعری تکنک سے شروعات کر کے لوکاچ آرٹ کے فلسفے کی طرف

رجوع کرتا ہے تاکہ وہ زندگی کے آخر مقصد سے متعلقہ سوالات کی نشان دہی کر سکے آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ لوکاچ نے اپنی ادبی تنقیدوں میں ہمیشہ زندگی کے بنیادی سوالوں پر زور دیا ہے

لوکاچ اوپر بیان کیے گیے ذہنی پس منظر میں دلتھی اور ہیگل کی مابعد الطبعیات کی طرف راغب ہوا اور زندگی کے معنی تلاش کرنے میں ثبوتی علوم کو بنیادی اہمیت نہ دیتے ہوئے ایک ایسے نظرئے کو اہمیت دی جس میں داخلی مشاہدے، دروں بینی اور ماورائی عرفان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ حقیقت کو ثبوتیت کے حامیوں کی طرح خانوں میں بانٹ کر سمجھنے کا قائل نہیں تھا بلکہ وہ ایک کلی وژن کی مدد سے سمجھنا چاہتا تھا۔ ہیگل اور مارکس کے یہاں یہ بات مشترک ہے کیونکہ یہ دونوں اپنے اپنے طور پر کلیت TOTALITY کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوکاچ پہلے ہیگل کی طرف اور اس کے ذریعے مارکس کی طرف آیا۔ ہیگل کے فلسفے سے گہری واقفیت نے اسے مارکسزم کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد کی اور یہی وجہ ہے کہ لوکاچ اسٹالنی دور میں ان روسی مارکسی دانشوروں کی سخت تنقید کرتا رہا جو مارکسزم کو میکانکی طور پر سمجھنا چاہتے تھے۔ لوکاچ نے روسی انقلاب سے پہلے دلتھی کے SCIENCE OF SPIRIT کو قبول کیا کیوں کہ اس فلسفے نے بھی حقیقت کو ٹکڑوں میں بانٹ کر جزئیات سے الجھنے کی بجائے ایک کلی تناظر میں سمجھنے کی ایماندارانہ کوشش تھی۔ اسی لیے اپنے ۱۹۱۲ والے پیش لفظ میں لوکاچ نے اپنی ۱۹۱۶ کی تصنیف THEORY OF THE NOVEL کو دلتھی کے سائنس آف اسپرٹ کا مخصوص نمائندہ قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوکاچ کی پہلی باقاعدہ مارکسی تصنیف HISTORY AND CLASS- CONSCIOUSNESS پر بھی اس کی انفرادی فکر کا سایہ ہے جو ہیگل کی مابعد الطبعیات سے متاثر تھی۔

ہم لوکاچ کے اس ذہنی پس منظر کے ساتھ پھر ان واقعات کی طرف لوٹتے ہیں جو اس کی زندگی میں اس دور میں رونما ہوئے۔ لوکاچ کی کمیون کی مختصر حکومت کی ناکامی کے بعد بوڈاپیسٹ سے فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا تھا جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ لیکن اس کا خاندان ابھی بوڈاپیسٹ میں ہی مقیم تھا۔ ٹامس منّ ۱۹۲۲ کے موسم بہار میں لوکاچ کے خاندان سے ملنے بوڈاپیسٹ گیا اور اس ملاقات کے بعد من ویانا لوٹا جہاں اس کی لوچ سے پہلی بار ملاقات ہوئی لوکاچ سے اپنی طویل گفتگو کے تاثرات ٹامس من نے اپنی تحریر میں محفوظ کیے ہیں۔ لوکاچ نے اسی زمانے میں اپنا مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا " اور پھر ایک بار نظر فریب سیاست "

YET AGAIN THE POLITICS OF ILLUSION اس مضمون میں بڑے سخت لفظوں
میں لوکاچ نے پارٹی افسر شاہی اور مطلق العنانیت کے بڑھتے ہوئے رجحان کی مذمت کی۔ یہ
مضمون بعد میں لاڈسلاس روڈاس نے اپنی کتاب "مہم جوئی اور نابودیت۔ بیلاکنس کی
سیاست اور ہنگری کی کمیونسٹ پارٹی کا بحران" میں شامل کیا۔ اسی زمانے میں لوکاچ نے
بیسویں صدی کے بہت ہی اہم فلسفیانہ مضمون "REIFICATION AND THE CONSCIOUS-
-NESS OF THE PROTARIAT" جو اس کی کتاب ہسٹری اینڈ کلاس کانشیئسنس میں مرکزی
اہمیت رکھتا ہے، مکمل کیا۔ اور ۱۹۲۳ء میں اس کی یہ معرکتہ الآرا کتاب شائع ہو کر منظر عام
پر آگئی۔ آرنسٹ بلوخ نے اس کتاب کی تعریف میں بڑی گرم جوشی سے ایک مضمون لکھا
کارل کوش KARL KORSCH نے بھی اسی سال اپنی مشہور کتاب مارکسزم اور فلسفہ
شائع کی۔ اس کتاب کا بنیادی رویہ لوکاچ کے ان مضامین سے بہت ملتا جلتا ہے جو پہلے
KOMMUNISMUS میں اور DIE INTERNATIONALE میں شائع ہوئے تھے اور بعد میں
تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS میں شامل
کر لیے گئے تھے۔ اسی ہم خیالی کی بنا پر دوسرے سال دونوں پر مارکسی نظریے میں تغیر پیدا
کرنے کا الزام لگا کر مذمت کی گئی۔ ہنگری کی کمیونسٹ پارٹی میں گروہ بندی اور آپس میں نظریاتی
مناقشے بھی زیادہ بڑھ گیے۔

۱۹۲۴ء میں لینن کے انتقال کے بعد سویت کمیونسٹ پارٹی میں بھی اقتدار پر قبضہ
جمانے کے لیے اسٹالن کے گروہ اور دوسرے گرہوں میں آپسی نزع تیز ہو گیا اور یہ نزع اکثر
نظریاتی جنگ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ لوکاچ کی ہسٹری اینڈ کلاس کانشین نسیس پر دو طرف
سے حملے ہوئے۔ ایک طرف کارل کارٹ نے جون ۱۹۲۴ء میں اپنے ایک مضمون میں جو
DIE GESSELLSCHAFT میں شائع ہوا حملہ کیا اور دوسری طرف روس کی کمیونسٹ پارٹی کے
فلسفی اے۔ دیبورین نے اس کی اپنے ایک مضمون "لوکاچ اور اس کی مارکسزم کی تنقید" میں
اس کتاب کی مذمت کی۔ لیڈسلاوس روڈاس، جو عام طور سے لوکاچ کی حمایت کرتا تھا، بھی
اب اس کے خلاف ہو گیا اور اپنے ایک طویل مضمون میں، جو تقریباً ایک کتاب کی ضخامت
رکھتا تھا، اس کی کتاب ہسٹری اینڈ کلاس کانشیس نیس پر سخت نکتہ چینی کی۔ اس سے اچھی طرح
اندازہ ہو جاتا ہے کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی پانچویں عالمی کانگریس میں خود بخارا زینوئیف نے

لوکاچ کے نظریات کی مذمت کی۔ اسی موقع پر لوکاچ نے لینن پر اپنی کتاب شائع کی۔ لوکاچ نے ۱۹۲۵ء میں ایک مضمون شائع کیا جس میں اس نے بخارن کی تاریخی مادیت والی کتاب کی کڑی تنقید کی اور یہ دکھایا کہ بخارن نے اپنی کتاب میں بالکل میکانکی طور پر مارکسزم کو پیش کیا ہے اور یہ کہ بخارن نے جو نتائج اخذ کیئے ہیں ان پر فلنا لوجیکل جبر DETERMINISM کا اثر ہے۔ اس کا یہ تنقیدی مضمون سوشلزم اور مزدور تحریک کی تاریخ کے مخطوطات میں شائع ہوا۔

لوکاچ کی کتاب تاریخ اور طبقاتی شعور پر تبصرے شائع ہوتے رہے۔ ان میں دوسرا اہم اور ہمدردانہ تبصرہ جوزیف ریوائی کا تھا جو اسی آرکایوز کے رسالے میں شائع ہوا۔ ۲۶-۱۹۲۵ء کے دوران ہی لوکاچ کی ملاقات اٹیلا جوزف سے ہوئی اور لوکاچ پہلا مارکسی دانشور تھا جس نے اس شاعر کی عظمت کو پہچانا اٹیلا نے اپنی بہن کو اس سلسلے میں ایک خط میں لکھا کہ "لوکاچ کہتا ہے کہ میں پہلا پرولتاریہ شاعر ہوں جس میں عالمی ادب کی صفات موجود ہیں"۔ اسی دوران ۱۹۲۶ء میں کارل کورش پارٹی سے نکال دیا گیا اور اب پارٹی میں لوکاچ کا ہم خیال اور اس کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ ۱۹۲۷ء میں لوکاچ کے والد کا بوڈاپیسٹ میں ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس کی ماں کا انتقال ۱۰ سال قبل ہی ہو چکا تھا۔ جینو لینڈلیر (JENO LANDLER) کا جس کے گروہ سے ہنگری کمیونسٹ پارٹی میں لوکاچ کا تعلق تھا، بھی ۱۹۲۸ء میں دل کا دورہ پڑ کر انتقال ہو گیا اور پارٹی کے سماجی اور معاشی تناظر میں مقالہ لکھنے کی ذمے داری اسی پر آن پڑی۔ لوکاچ کا یہ مقالہ بعد میں "BLUM THESES" کے نام سے مشہور ہوا اور اس میں آگے چل کر عمل میں آنے والے مقبول محاذ (POPULAR FRONT) کی پیش بینی کی گئی تھی۔ مگر یہ نظریہ کامنٹرن کے اجلاس میں نامنظور کر دی جاتی ہے۔ کامنٹرن کی مجلس عاملہ کا ہنگری کی کمیونسٹ پارٹی کے نام کھلا خط اس بات پر زور دیتا ہے کہ کامریڈ بلوم کی لینن مخالف تھیسس پر شدید حملہ کیا جائے جو لینن کے پرولتاری انقلاب کے نظریے پر نیم سوشل ڈیماکریٹک اور نابودیت قسم کے نظریے کو ترجیح دیتا ہے اس سخت تنقید کی وجہ سے لوکاچ کو خود انتقادی قسم کا اعلان شائع کرانا پڑا اور اس کی اس شکست کی وجہ سے عملی سیاست سے لوکاچ تقریباً ۳۰ برس تک الگ رہا۔ اسی زمانے میں آسٹرین حکومت لوکاچ کو ملک بدر کرنے کا نوٹس واپس لے لیتی ہے۔ لیکن لوکاچ نے بددل ہو کر ہمیشہ کے لیے ویانا کو خیرباد کہہ دیا۔

۱۹۲۹ء میں لوکاچ نے ماسکو کا رخ کیا اور یہاں آکر مارکس۔ اینگلس۔ لینن انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہوگیا ۱۹۲۹ سے لیکر ۱۹۳۱ تک دو سال لوکاچ کے ذہنی ارتقا میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈی۔ ریازانوف اس ادارے کا ڈائریکٹر تھا۔ ریازانوف نے لوکاچ کو پہلی مرتبہ مارکس کے معاشی اور فلسفیانہ مخطوطات جو اسنے ۱۸۴۴ء میں تیار کئے تھے دکھائے ان مخطوطات کا لوکاچ کے ذہنی ارتقا پر بڑا زبردست اثر پڑا۔ اسی زمانے میں لوکاچ کو لینن کی PHILOSOPHICAL NOTE BOOKS جو ۱۹۲۹/۳۰ء میں شائع ہوئی پڑھنے کا موقع ملا۔

ان تحریروں کا بھی لوکاچ کے ذہنی ارتقا پر فیصلہ کن اثر ہوا ان نوٹ بکس کو بڑھ کر لوکاچ کا ہیگل سے متعلق تصور ہی بدل گیا۔ اسی طرح لوکاچ کے علم الادراک EPISTEMOLOGY موضوع اور معروض کے رشتوں اور فن اور سماجی حقیقت کے درمیان رشتے کے متعلق تصورات ہی بدل گئے۔ ۱۹۰۰ کے بعد لوکاچ کے لیئے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنی سیاسی مصروفیات یا مضامین اور کتابیں وغیرہ شائع کرنے کے دباؤ سے فراغت پاکر صرف مطالعہ کرنے پر وقت خرچ کر رہا تھا اس مطالعہ سے لوکاچ کی ذہنی بنیادیں کافی مضبوط ہوگئیں اور اس کی آئندہ تصنیفات میں مددگار ثابت ہوئیں۔ ۱۹۳۱ء میں لوکاچ برلن لوٹ آیا اور نازیوں کے اقتدار میں آنے تک یعنی ۱۹۳۳ء تک یہیں مقیم رہا۔ اسی دوران وہ جرمن مصنفوں کی انجمن کے برلن گروپ کا نائب صدر اور پرولتاری۔ انقلابی مصنفین کی لیگ کا صف اول کا رکن رہا اور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیان پرولتاری۔ انقلابی مصنفین کی لیگ کے پروگرام کا خاکہ تیار کیا۔ ۱۹۳۳ء میں اس نے "میرا راستہ مارکس تک" بین الاقوامی ادب میں شائع کیا۔ اور اسی سال جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ نازی اس کی تلاش میں ہیں، وہ جرمنی سے ماسکو واپس لوٹ گیا

"میرا راستہ مارکس تک" میں لوکاچ بتاتا ہے کہ وہ کس طرح مارکسزم کی طرف راغب ہوا اور ہمیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ لوکاچ اپنے اسکول (GYMNASIUM) کے ہی دنوں میں کمیونسٹ منشور پڑھ کر اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے نہ صرف مارکس کے دوسرے پمفلٹ بلکہ راسمال پڑھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لیکن سوشلزم کی طرف راغب ہونے کے باوجود اس زمانے میں لوکاچ کے بنیادی نظریئے میں کوئی فرق نہیں آیا اور اس کی وجہ ۱۹۳۳ء میں لوکاچ ہمیں یوں بتاتا ہے۔

"جیسا کہ عام طور پر بورژوا دانشوروں کے ساتھ ہوتا ہے یہ اثر (یعنی مارکس کا اثر)

معاشیات اور خاص کر سماجیات تک محدود تھا۔ مادّی فلسفے کو میں ـــ اس وقت تک جدلیاتی مادیت اور غیر جدلیاتی مادیت میں تمیز نہیں کرتا تھا ـــ علم العرفان کے معاملے میں بالکل قدیم نظریہ سمجھتا تھا۔ اس زمانے میں شعور کے حلول IMMANANCE OF CONSCIOUSNESS کا کانشین نظریہ میری طبقاتی حیثیت اور عالمی تناظر کے عین مطابق تھا۔ میں نے اس نظرئیے پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی اور اسے علم الادراک کی دریافت کا ابتدائی مرحلہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ انتہائی قسم کے موضوعی تصوریت کے متعلق میری ذہنی تحفظات تھے کیوں کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ حقیقت کو محض شعور کی باطنیت کے زمرے میں رکھ کر سمجھا جا سکتا تھا REALITY COULD NOT BE SIMPLY TREA-TED AS AN IMMANENT CATEGORY OF CONSCIOUSN-ESS۔ لیکن اس سے میں مادیت کے نتائج تک نہیں پہنچا۔ بلکہ ان فلسفیانہ مکتبوں کی طرف راغب ہوا جو اس سلسلے کو غیر عقلی۔ اضافیت کے طریقے سے، جو کچھ حالتوں میں پر اسراریت کی طرف لے جاتا ہے، حل کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل سمّل کے زیر اثر جس کا میں اس زمانے میں شاگرد تھا، میں نے مارکسی فکر کے عناصر کو ایسے ہی عالمی نظریے میں سمونے کی کوشش کی۔"

لوکاچ جس روایتی ذہنی ماحول میں پل کر بڑا ہوا تھا اس کو دیکھتے ہوئے اس بات پر ہمیں حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا سوشلزم کی طرف رجحان ہو جانے کے باوجود وہ مادیت یا مادی جدلیات کو فلسفے کے طور پر قبول نہیں کر سکا تھا۔ ویسے بعض نقادوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ دراصل لوکاچ نے ۱۹۱۴ء سے پہلے سوشلزم قبول ہی نہیں کیا تھا اور نہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو بورژوا دانشور مارکس کے طبقاتی کشمکش کے نظریے کو اتنی آسانی سے قبول کر سکتا ہو وہ مقابلتاً کم نقصان پہنچانے والے فلسفیانہ مادیت کے نظریہ کو کیوں قبول نہیں کرے گا؟ ان نقادوں کا خیال ہے کہ لوکاچ اسٹالنی دور کے دباؤ سے مجبور ہو کر ۱۹۲۳ء میں روس میں اسٹالن کا خوف پھیلا ہوا تھا) یہ جتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ شروع سے ہی سوشلزم کی طرف راغب رہا ہے ورنہ درحقیقت لوکاچ سویت انقلاب کے بعد ہی مارکسی انقلابی نظریے کی طرف راغب ہوا۔ جورج لشتھائم کا کہنا ہے کہ "پہلی عالمی جنگ سے قبل لوکاچ فلسفیانہ نظریات کے اعتبار سے لاسک کے نو کانٹینزم، دلتھی کی نو ہیگلیت، کرسکے گارڈ کی مذہبی غیر عقلیت اور گنڈولف اور جورج کی جمالیت کی نظریاتی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس دور میں لوکاچ کی فلسفیانہ

تحریروں میں مارکسی نظریاتی عناصر اتنے ناقابل محسوس ہوتے ہیں کہ اس کے پکے معتقد بھی ان کی نشان دہی کرنے میں ناکام رہے ہیں" بہرحال لوکاچ نے مارکسی نظریات کو پہلی عالمی جنگ سے پہلے قبول کیا یا بعد میں اس سے اس کی دانشورانہ عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ لوکاچ جیسے حساس ذہن کی کشمکش سے اس دور کے وسطی یورپ میں مقبول عام ILLUSIONS اور عقائد کے ٹوٹنے سے پیدا ہونے والے کرب کا ضرور احساس ہوتا۔

۱۹۳۳ء میں لوکاچ ماسکو واپس آیا مگر بیلا کون (BELA KUN) جو اس وقت ہنگری کی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر تھا لوکاچ کا اس مخالف گروہ سے تعلق تھا، نے اس بات کی کوشش کی کہ لوکاچ اور اس کے خاندان کو ماسکو میں رہائش اختیار کرنے کی اجازت نہ ملے لوکاچ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ کامنٹرن کی عمارت کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر احتجاج کرے۔ کیوں کہ کامنٹرن کے دفتر پر کئی غیر ملکی آئے تھے جو لوکاچ کو اچھی طرح جانتے تھے اس بین الاقوامی ادارے کے عہدے داران کے لیے اس کا یوں احتجاج کرنا شرمندگی کا باعث ثابت ہوا اور لوکاچ کو ماسکو میں مع اپنے خاندان کے رہائش کی اجازت مل گئی۔ لوکاچ ماسکو میں انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی آف سوویت اکیڈیمی آف سائنس سے وابستہ ہو کر کام کرنے لگا۔

لوکاچ نے نوجوان ہیگل پر کام کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ دراصل اس نے اس وقت تصور کیا تھا جب وہ پچھلی مرتبہ ماسکو آیا تھا اور اسے مارکس کے معاشی اور فلسفیانہ مسودات اور لینن کی فلسفیانہ نوٹ بکس دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ ان مسودات کا لوکاچ کے ذہن پر اتنا اثر ہوا تھا کہ یہ اس کے لیے ایک نیا ذہنی موڑ ثابت ہوئے۔ یہ کام اس نے ۳۸/۱۹۳۷ء میں ختم کیا۔ لوکاچ نے برلن میں بھی ۳۳/۱۹۳۱ء کے درمیان اس پر کام شروع کیا تھا مگر اسے دوسری مصروفیات کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا سکا

اسی زمانے میں لوکاچ ادبی تنقید پر بھی کام کرتا رہا۔ اس میدان میں میخائل لفشٹز اس کا شریکِ کار تھا۔ لوکاچ کی لفشٹز سے دوستی ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی جب وہ مارکس۔ اینگلس لینن انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ تھا۔ میخائل لفشٹز پر بعد میں وسیع COSMOPOLITANISM (کمیونسٹ پارٹی میں جو لوگ پارٹی آرتھوڈوکسی کو قبول نہ کرتے ہوئے وسیع بنیادوں پر مارکسزم کی تعبیر کرتے ہیں ان کو پارٹی جارگن میں کوسموپولیٹن کہا جاتا ہے۔) کا الزام لگایا لیکن لوکاچ نے اس کے باوجود اپنے دوست کو دغا نہیں دیا اور اپنی کتاب THE YOUNG HEGEL

کے دونوں ایڈیشن یعنی ویافارورج ایڈیشن آف ۱۹۴۸ء اور مشرقی جرمن ایڈیشن آف ۱۹۵۴ء الفشٹز کے نام سے ہی منسوب کیئے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ ادبی تنقید میں بھی اسٹالنی دور کے دباؤ کے باوجود لوکاچ نے ادبی تنقید میں ایک حد تک آزادروی اختیار نہ کی حالانکہ کئی باتوں میں اسے ماسکو کے قیام کے دوران جھکنا بھی پڑا۔ اس مسئلے پر ہم آگے چل کر اور روشنی ڈالیں گے۔ جن لوگوں پر کوسموپولٹنزم کا الزام لگا ان کا ایک باقاعدہ حلقہ تھا اور ان کا ایک رسالہ LITERATURNY CRITIQUE کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ لوکاچ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا بھی اس حلقے سے تعلق تھا۔ بعض دفعہ تو اسے اس حلقے کا ذہنی رہنما بھی قرار دیا گیا اسی طرح لوکاچ کا تصادم ہنگری کے ادیبوں کے "PROLETEULT" (پرولتاری مشرب: جو ادیب اور پارٹی ممبر کوسموپولٹنزم کے خلاف تھے اپنے گروہ کو اسی نام سے منسوب کرتے تھے) گروہ سے ہوا جس میں اور لوگوں کے علاوہ بیلاکسن کا داماد بھی شریک تھا (بیلاکسن سے لوکاچ کے گہرے سیاسی اختلافات چلے آرہے تھے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا سکا ہے (اسی پرولتار مشرب والے گروہ نے اٹیلا جوزف جو لوکاچ کے خیال سے بہت اچھا پرولتاری شاعر تھا؛ کی سخت مذمت کی اور اس کے متعلق یہاں تک کہا گیا کہ وہ ایک ایسا پیٹی بورژوا شاعر ہے جو اپنے داخلی بحران کا حل فاشسٹ کیمپ میں تلاش کرنا چاہتا ہے۔

جمالیاتی نظریے پر بھی لوکاچ لفشٹز کے اشتراک سے کام کرتا رہا۔ لوکاچ نے مارکس کے ادبی ورثے پر بھی کام شروع کیا اور مارکسی جمالیاتی نظریے کا ایک عام خاکہ تیار کیا۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۹۳۳/۳۵ کے دوران لوکاچ کی دوسرے مارکسی ادیبوں سے جس میں برخیت اور ارنسٹ بلوخ بھی شامل تھے EXPRESSIONISM (تعبیریت) پر بحث ہوتی رہی۔ دراصل اس مناظرے کی ابتدا ہی برلن میں ہو گئی تھی اور یہ چوتھے دہے کے اختتام تک چلتا رہا۔ لوکاچ نے ۱۹۳۵ء کے بعد اپنی کتاب "THE YOUNG HEGEL" جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ ختم کی۔ اس کتاب کو اس نے اپنی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے طور پر پیش کی اور اسی مقالے پر سویت اکادیمی آف سائنس نے اسے ڈاکٹر آف فلاسفی کل سائنس کی ڈگری عطا کی۔ یہاں اس بات پر زور دینا ضروری ہوگا کہ لوکاچ پر ہیگل کے فلسفے کا خاصا اثر تھا۔ بعض نقادوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اسے فلسفے میں مادیت کا حامی کہنے سے زیادہ صحیح بائیں بازو کا ہیگل وادی کہنا ہوگا لوکاچ پر ہنگری کے ایک دانشور SZABO کا بھی بہت اثر تھا۔ زابور کے ہی ذریعے اس نے

سنڈیکلزم کا اثر قبول کیا، ۱۹۲۲ء تک جب اس نے اپنی کتاب ہسٹری اینڈ کلاس کانشیئنس شائع کی لوکاچ اور لینن کے فلسفیانہ موقف میں بھی ٹکراؤ تھا کیوں کہ لینن کے برعکس لوکاچ مارکسی فکر میں ہیگل کی سمت پر زور دیتا ہے۔ روزالکزمبرگ اور سنڈیکلزم کے اثر کے تحت لوکاچ کے یہاں ہمیں سیاسی انتہاپسندی بھی نظر آتی ہے لیکن اس کی سیاسی انتہاپسندی کی کڑی نکتہ چینی بھی کی گئی خاص کر جب اس نے چناؤ کے بائیکاٹ کا نعرہ لگایا تھا۔ اور یہ بھی ہیگل کا ہی اثر تھا کہ لوکاچ کے یہاں شعور کے رول پر زیادہ زور ملتا ہے۔ شعور کا رول کہیں کہیں لوکاچ کے یہاں بالکل فیصلہ کن محسوس ہونے لگتا ہے گویا کہ خارجی تاریخی عمل شعور کو نہیں شعور اس اس عمل کو متاثر کرتا ہے۔

لوکاچ نے ۱۹۳۶ میں اپنی ایک اور مشہور تصنیف THE HISTORICAL NOVEL مکمل کی اب بھی لوکاچ کا تصادم پرولتاری مشرب PROLETEULT اور ژدھانوف کی سوشلسٹ حقیقت نگاری کی لائن سے جاری تھا۔ لیکن یہ زمانہ پاپولر فرنٹ کا زمانہ تھا جس کا پرچار لوکاچ پہلے کر چکا تھا۔ اس لیے کم از کم سیاسی اعتبار سے لوکاچ کی پوزیشن قدرے بہتر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوکاچ ایک حد تک اسٹالن کے عتاب سے بچا رہا۔ اسی عرصے میں ماسکو سے ہنگری زبان میں ایک رسالہ "نئی آواز" شروع ہوا ہنگری کے دوسرے دانشوروں کے ساتھ لوکاچ بھی اس کی مجلس ادارت کا ایک اہم رکن تھا۔ اس کے دوسرے شمارے سے لوکاچ کا بڑا ہی قریبی اور قابلِ اعتماد دوست ANDOR GABOR اس کا مدیر اعلیٰ مقرر ہو گیا۔ لوکاچ نے اس اہم ہنگرین رسالہ کی ذہنی سمت کے تعین میں بہت ہی اہم رول ادا کیا اسی طرح ۱۹۲۵ سے لوکاچ INTERNATIONALE LITERATUR کی مجلس ادارت کا بھی اہم رکن رہا لیکن ۱۹۳۹ سے جبکہ سیاسی حالات ابتر ہوتے جا رہے تھے پرانا نظریاتی تصادم پھر تیز ہو گیا۔ اب فدیئف۔ یرمیلو گروپ نے پارٹی کے اعلیٰ سطح کے رہنماؤں کی مدد سے رائٹرز ایسوسیشن کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس گروپ نے LITERATURNY CRITIQUE جس کے ذریعہ لوکاچ عام طور پر روسی زبان میں اپنے مضامین شائع کرتا تھا، بند کر دیا اور اس طرح لوکاچ ایک اہم ادبی ذریعۂ اظہار سے محروم ہو گیا۔ اسی زمانے میں لوکاچ نے انٹرنیشنل لٹرا تور نام کے رسالے میں اپنا مضمون TRIBUNE OF THE PEOPLE OR BUREAUCRAT شائع کیا۔ اسٹالنی دور میں افسر شاہی پر یہ سب سے زیادہ کڑی نکتہ چینی ہے اور یہ کہنا بھی بیجا نہ ہو گا کہ افسر شاہی پر اس سے بہتر

دروں بینی پر مبنی تنقید مشکل ہی لکھی گئی ہوگی۔ ویسے اس سلسلے میں از اک ڈائنشر کے مضامین اور تحریریں بھی قابل ذکر ہیں لیکن از اک ڈائنشر ایک سیاسی مبصر تھا اور ٹراٹسکی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ سب سے پہلے ٹراٹسکی نے ہی اسٹالن کی کڑی تنقید کرتے ہوئے اس کے عہد میں پارٹی میں پیدا ہونے والی افسر شاہی پر زبردست چوٹ کی تھی۔

لیکن ٹراسکی وادی ہونے کے الزام سے لوکاچ بھی نہیں بچ سکا۔ ۱۹۴۱ء میں اسے گرفتار کر کے مہینوں تک جیل میں بند رکھا گیا۔ پولس افسروں نے اس سے اس بات کا اقرار کروانے کی بھرپور مگر ناکام کوشش کی کہ اس کا تعلق ٹراسکی وادیوں سے ہے اور یہ کہ شروع سے ہی وہ ٹراسکی کا ایجینٹ رہا ہے۔ آخر اسے کامنٹرن کے جنرل سیکریٹری دیمتروف کی ذاتی سفارش پر رہا کیا گیا۔ دیمتروف پر جرمن، آسٹرین، فرانیسی، اطالوی اور ہنگری کے دانشوروں نے لوکاچ کی رہائی کے لیے دباؤ ڈالا تھا جو اس وقت سویت یونین میں مقیم تھے اپنی رہائی کے بعد لوکاچ نے ہنگری اور جرمن ادب پر کئی مضامین چھپوائے جس میں FAUST STUDIES بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اسی دوران میں ہنگری زبان کا رسالہ UJ HANG (نئی آواز) جس سے لوکاچ متعلق تھا بند ہو گیا۔

تیسرا باب

سوویت یونین میں لوکاچ ایک اور وجہ سے، جس کا کسی حد تک اوپر ذکر کیا جا چکا ہے مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اور یہ وجہ تھی — یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے — لوکاچ کا مغربی طرز کا مارکسی واد WESTERN MARXISM اس دور کے سوویت یونین کے دانشورانہ تنازعات کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر کا سمجھنا بہت ضروری ہے خاص کر اس لیے کیوں کہ لوکاچ کا بھی ان تنازعات سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ہم اختصار کے ساتھ اسے یہاں پیش کرتے ہیں۔

سوویت مارکسزم کی بنیاد دراصل لینن اور پلیخانوف کی تحریروں پر تھی۔ سوویت یونین میں ایک باقاعدہ اور ہمہ گیر نظریے کے طور پر مارکسزم کو سب سے پہلے پلیخانوف اور لینن نے ہی پیش کیا۔ یہ دونوں عظیم مفکر راسخ العقیدہ مارکس وادی تھے اور انہوں نے اینگلس کے ثبوتیتی مارکسزم کا گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اینگلس نے مارکس کے انتقال کے بعد مارکس کی تحریروں کی جو تالیف کی تھی اس سے لینن اور پلیخانوف دونوں ہی متاثر رہے۔ لینن نے اپنی اہم فلسفیانہ تصنیف MATERIALISM AND EMPERIO CRITICISM کے لیے بھی اینگلس کے مادی جدلیات کے تصورات کو بنیاد بنایا اور اس طرح روس میں لینن کی تحریروں سے اینگلس کی کی ہوئی مادی جدلیات کی ثبوتیتی تعبیر مقبول سے مقبول ہو گئی۔ سیاسی اعتبار سے بھی روس کے حالات سینٹرل یورپ سے بہت مختلف تھے اور اسی لیئے لینن کو ان ہی حالات میں سیاسی اعتبار سے بھی مارکسزم کی قدرے مختلف تعبیر کی۔ وسطی یورپ کو فلسفیانہ نظریات اور سیاسی حالات دونوں اعتبار سے بالکل مختلف حالات کا سامنا تھا۔ ظاہر ہے یہاں کے دانشور مارکسزم کی ان حالات سے متاثر ہو کر تعبیر کر رہے تھے۔ لوکاچ کی کتاب HISTORY AND CLASS-

CONSCIOUSNESS - جب شائع ہوئی تو سویت مارکسی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا کیوں کہ اس کتاب میں لوکاچ نے مارکسزم کی جو تعبیر کی تھی وہ لینن والی تعبیر سے بہت مختلف تھی۔ لوکاچ کے یہاں سارا زور مارکسی فکر میں ہیگل والی سمت کی تلاش پر تھا جب کہ لینن اینگلس کی ثبوتیت سے زیادہ متاثر تھا۔ اس میں لوکاچ کا REIFICATION پر مرکزی مضمون مارکسزم کی اس مختلف تعبیر کا بین ثبوت ہے۔

سیاسی اعتبار سے بھی لوکاچ کے ذہن پر مختلف اثرات کام کر رہے تھے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا لوکاچ پر SZABO کا، جو ANARCHO-SYNDICALIST تھا کافی اثر تھا یہی وجہ ہے کہ لینن واد کو پوری طرح سے قبول کرنے سے پہلے لوکاچ سیاسی اعتبار سے روزالکزمبرگ کی طرف مائل ہوا۔ روسی حالات کے زیر اثر لینن کے یہاں سیاسی پارٹی میں سارا زور ڈسپلن اور مرکزیت پر تھا تاکہ انقلابی مارکسیوں کی پارٹی پورے مرکز اور یکجہتی کے ساتھ انقلاب کی سمت میں آگے بڑھ سکے۔ اس کے برخلاف روزالکزمبرگ کھلی ہوئی جمہوری قسم کی پارٹی کی قائل تھی اور وسطی یورپ کے حالات میں ایسی پارٹی کا وجود ممکن بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مارکسزم کی سیاسی تعبیر میں لوکاچ نے اپنے جرمنی کے قیام کے دوران لینن کے بجائے لکزمبرگ کا اثر قبول کیا۔ لیکن لوکاچ کا یہ ذہنی پس منظر روس میں جو تھے دہے کہ درمیان جب وہاں سخت قسم کی سیاسی جد وجہد ہو رہی تھی اور لوگ اسٹالن کی دہشت سے سخت خوف زدہ تھے، اس کے لیے ایک بڑا ہی وبال جان بن گیا۔ لوکاچ، کارل کورش وغیرہ پر مارکسزم سے انحراف کا الزام لگا اور ان کے WESTERN MARXISM کو ہدف ملامت بنایا جانے لگا۔ روسیوں کے سامنے ایک بڑا مشکل مسئلہ تھا، انقلاب سے پہلے روس میں کئی مختلف انقلابی گروہ پائے جاتے تھے جن میں سنڈیکلیسٹ، انارکسٹ بائیں بازو کے سماج وادی، امن پرست وغیرہ قسم کے کئی عناصر شامل تھے۔ انقلاب کے بعد روسی بالشویک پارٹی کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ان مختلف الخیال معاملوں میں باہم متصادم گروہوں کو منظم کرنا تھا تاکہ وہ ایک جماعت کے جھنڈے تلے جمع ہو سکیں۔ اس نقطۂ نظر سے ان سیاسی رہنماؤں اور پارٹی آئیڈیالوگز (نظریہ سازوں) کے لیے یہ بات بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ تمام لوگ اور بالخصوص دانشور مارکسزم کی اس تعبیر کو بغیر کسی انحراف کے قبول کر لیں جو لینن نے کی تھی۔ اس معنی میں ویسٹرن مارکسزم انھیں ایک فتنے سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ یہی

وجہ ہے کہ لوکاچ کی کتاب "تاریخ اور طبقاتی شعور" جو مارکسزم کی لینن کے مسلک سے ہٹ کر ایک نئی تعبیر تھی شائع ہونے پر اس کے خلاف لعنت ملامت کا ایک طوفان آگیا۔

روسی کمیونسٹوں کے لیے مارکسزم۔لینن ازم سے معمولی سا انحراف بھی ان کے ایمان کی توہین تھی ان کو یہ خوف تھا کہ اس قسم کا انحراف اگر برداشت کر لیا گیا تو بہت جلد مارکسزم۔لینن ازم کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی اور سیکڑوں مسلک بن جائیں گے۔اسی لیے۔ اے۔ایم دیبورن، آئی لپتول، جی بامبل وغیرہ جیسے روسی نظریہ سازوں نے لوکاچ کے خلاف نظریاتی جہاد کا اعلان کر دیا اور اس جہاد میں سیاست داں بھی شامل ہو گیے ۱۹۲۴ء کامنٹرن کے پانچویں بین الاقوامی اجلاس میں بخارن، جو لینن کے بعد اس زمانے میں ایک اہم پارٹی تھیورٹیشین سمجھا جاتا تھا، نے بھی مارکسزم کو ہیگل کی روشنی میں پیش کرنے والوں کی سخت مذمت کی۔زینوفیف جس کی ذہنی صلاحیتیں بخارن کے مقابلے میں کمتر تھیں توان "بائیں بازو کے انتہا پرستوں پر بری طرح برس پڑا اور ان کی بڑی سخت مذمت کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہم ایسے انحرافات کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔

فلسفیانہ اعتبار سے لینن اور لوکاچ کے موقفوں میں ایک حد تک بنیادی فرق تھا۔ اینگلس اور لینن کے یہاں سارا زور مادی جدلیات پر تھا جب کہ لوکاچ کے یہاں صرف جدلیات پر۔اسی لیے لوکاچ کی تاریخ اور طبقاتی شعور کا ذیلی عنوان "مارکسی جدلیات کا مطالعہ" رکھا گیا تھا نہ کہ "مادی جدلیات" کا اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ لوکاچ "مادیت کو اس معنیٰ میں قبول نہیں کر رہا تھا جس معنیٰ میں مارکسزم کو سمجھتے ہوئے اینگلس یا لینن نے کیا تھا۔ یہی نہیں لوکاچ نے اینگلس کی کانٹ اور ہیگل کے متعلق تفہیم کو مشکوک ٹھہراتے ہوئے روشن خیال دور PERIOD OF ENLIGHTENMENT کی مادہ پرستی کو بورژوا انقلاب کی نظریاتی ہیئت قرار دیا "لینن ازم" سے یہ انحراف روسی کمیونسٹوں کے لیے واقعی ناقابلِ برداشت تھا۔

حالانکہ لینن نے ہیگل کو اچھی طرح پڑھا تھا اور خاص طور سے اس کی منطق کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ہیگل کی منطق کی اس نے اپنی فلسفیانہ نوٹ بک میں جو اس نے ۱۶۔۱۹۱۴ء میں تیار کی تھی تعریف بھی کی ہے۔لیکن لینن کے عالمی تناظر پر فرنچ مادہ پرستی کا جو اٹھارویں صدی میں رائج تھی، بہت اثر پڑا تھا اور ایک حد تک مارکسزم بھی اسے اسی منطق کا نتیجہ دکھائی دیتا تھا

ہیگل کی جدلیات اور مادہ پرستی میں جو باہم تضاد یا ناآہنگی تھی لینن نے اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ لینن کی EMPERIOCRITICISM کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کانٹ کے فلسفیانہ نظریات کا سخت مخالف تھا۔ لینن کا خیال تھا کہ کانٹ کے فلسفیانہ نتائج مادہ پرستوں کے لیے خاص طور سے بڑے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ کانٹ علم الوجود کے اعتبار سے لاادراکی AGNOSTIC تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم شئے بالذات THING-IN-ITSELF کی حقیقت کو کبھی نہیں جان سکتے۔ دوسرے لفظوں میں مظہر PHENOMENON اور اس کی ذات NOUMENON میں فرق ہے۔ ذات کا عرفان ممکن نہیں جب کہ اس کے مظہر کا عرفان ممکن ہے۔ لینن کا خیال تھا اور یہ بات ایک حد تک درست تھی کہ اگر کانٹ کے فلسفے کو قبول کر لیا گیا تو اس سے مذہبی مابعد الطبعیات کے دروازے کھل جائیں گے اور اس نظریے کا کوئی جواز نہیں رہے گا کہ ذہن سے الگ خارجی دنیا کا وجود ہے اور تجربی سائنس محض ایک افسانہ ثابت ہوگا۔ مادی جدلیات کا لینن کے فلسفے میں بہت اہم بلکہ کلیدی مقام تھا اور اگر کانٹ کے نظریاتی موقف کو جگہ دی گئی تو مادی جدلیات کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر مادے کا الگ سے وجود تسلیم نہ کیا جائے تو تصوریت پر مبنی مابعد الطبعیات کی مخالفت کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

مگر لوکاچ کا فلسفیانہ موقف اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ مادہ پرستی کو فلاطونیت کی معکوس INVERTED شکل قرار دیتا تھا۔ دراصل لوکاچ جس کی نوکانٹین فلسفے کے مکتب میں گہری تربیت ہوئی تھی کانٹ کے فلسفے کو بالکل دوسرے انداز سے سمجھتا تھا۔ لوکاچ کا خیال تھا کہ اینگلس نے بھی کانٹ کے سمجھنے میں غلطی کی۔ اس نے کانٹ ہیوم کی کاٹ کرنے لیے تجربے پر زور دیا تاکہ مادے کا خارجی وجود ثابت کیا جا سکے۔ اور یہ بھی کہ خارجی وجود کا صحیح علم ممکن ہے۔ لیکن لوکاچ کہتا ہے کہ یہ کانٹ کی مظہریت PHENOMENOLOGY کو غلط سمجھنے کا نتیجہ تھا۔ لوکاچ کے مطابق کانٹ کی مظہریت سائنٹفک علم کی بے روک ٹوک اور تمام ممکنہ ترقی کو ہرگز مشکوک قرار نہیں دیتی۔ کانٹ نے تو بالکل دوسری بات پر زور دیا تھا۔ کانٹ تو مظہر اور اس کی ذات میں پر زور دیکر یہ جتانا چاہتا تھا کہ فطری مظاہر کی مکمل واقفیت کے بعد بھی انسانی ذہن کے لیے یہ پریشان کن بات رہے گی ہی کہ وہ خارجی کائنات کا مشاہدہ اپنے شخصی حسّی آلات کے ذریعے کرتا ہے اور یہ حسّی آلہ اس کے تجربے

کے خارجی مواد پر اپنی ہی ہیئت نافذ کرتا ہے۔

اینگلس کے نزدیک مادیت محض ایک خارجی حقیقت نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتی تھی اینگلس کے خیال سے مادہ خارجی کائنات میں شئے مطلق کی حیثیت سے اولیت رکھتا ہے۔ اس معنیٰ میں مادیت محض علم الادراک نہیں بلکہ مابعد الطبعیاتی نظریہ بن جاتی ہے کیوں کہ اس دعوے کو نہ رد کیا جا سکتا نہ ثابت۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اینگلس اس معاملے میں مارکس کے نظریے کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے یا نہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مارکس نے ہیگل کی تنقید کی اور مادیت پر زور دیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مارکس نے مادیت کو علم معرفت سے بڑھ کر اس معنیٰ میں تسلیم کیا تھا کہ مادہ روح سے بنیادی طور پہ کچھ زیادہ حیثیت رکھتا ہے بہرحال مارکس نے جو کچھ بھی اس کے معنیٰ مراد لیے ہوں لوکاچ ۱۹۲۳ء میں اینگلس کے اس فلسفیانہ موقف کے خلاف تھا۔

لوکاچ نے ۱۹۲۳ء میں "تاریخ فلسفہ اور طبقاتی شعور" میں جدلیاتی نظریہ پیش کیا اس کا لب لباب یہ تھا کہ مادیت اور اسپریچولزم میں باہم تضاد کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ موضوع اور معروض کے درمیان خلیج کو عبور نہ کر سکنے کی وجہ سے اس سارے مباحثے میں مادیت اور روحانیت کو دعویٰ اور رد دعویٰ کے طور پر مان لیا گیا ہے۔ اس کا حل کسی ایک کو تسلیم کر لیتے ہیں بلکہ اس جھگڑے سے ماورا جا کر مارکس کی اس بات کو تسلیم کر لینے میں ہے کہ تخیل اور حقیقت کا ٹھوس اتحاد عمل میں رہے۔ عمل کے ذریعہ ہی اس تضاد کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسی مرحلے پر شعور کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ شعور کا کیا رول ہے؟ کیا یہ محض خارجی حقیقت کا ثبوتیتی معنیٰ میں عکس ہے؟ یا شعور کا اپنا ایک جدلیاتی رول ہے جس کے مطابق خارجی حقیقت اس سے متاثر ہو سکتی ہے یہاں یہ بات ہمیں زور دے کر کہنا ضروری ہے کہ لینن نے شعور کو اول الذکر معنیٰ میں کبھی نہیں لیا۔ اس کے نزدیک شعور خارجی حقیقت کا منفعل عکس نہیں ہے۔ اسی لیے لینن اس بات کا قائل نہیں تھا کہ ہمیں خارجی حقیقت میں تبدیلی لانے کے لیے اس وقت تک خاموشی سے انتظار کرنا چاہیے جب تک وہ خود بخود اس مرحلے میں داخل نہ ہو جائے کارل کاؤٹسکی نے مارکسزم کی کچھ ایسی ہی تعبیر کی تھی جو ڈارون کے ارتقائی نظریے کا میکانکی چربہ معلوم ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ لینن نے کاؤٹسکی کی کڑی تنقید کی اور اس کے نظریے کو ناقابل قبول قرار دیا۔

لینن کے یہاں ہمیں شعور کی اہمیت پر زور ملتا ہے۔ لینن نے اس بات پر زور دیا

کہ باشعور انقلابی پارٹی کے اراکین خارجی حالات کا صحیح تجزیہ کرتے ہوئے اپنی شعوری کوششوں سے
سماج میں انقلابی تبدیلی لاتے ہیں۔ وہ محض ہاتھ پر ہاتھ دھر کر خود بخود انقلاب ہو جانے کا انتظار نہیں کرتے
اس حد تک لوکاچ اور لینن کے نظریے میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ مگر یہاں بھی تھوڑا سا
فرق ہے جسے ہمیں ذہن نشین کرنا چاہیئے۔ لینن کے یہاں سارا زور باشعور پارٹی اراکین پر ہے
جو انقلابی نظریئے سے لیس ہو کر انقلاب کے اگوا دستے کا کام کرتے ہیں اور اپنی شعوری
کوششوں سے انقلاب برپا کرتے ہیں۔ لوکاچ اس کے برخلاف اس بات پر زور دیتا ہے کہ
پرولتاریہ جو سب سے زیادہ انقلابی طبقہ ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج سے خود بھی نجات حاصل
کرے گا اور سرمایہ دارانہ سماج کی غیر انسانی زیادتیوں سے نجات حاصل کرنے کے عمل میں
ساری انسانیت کو اس سے نجات دلائے گا۔ لوکاچ ایک معنیٰ میں ۱۹۲۳ء میں مارکس کے
۱۸۴۴ء والے مخطوطات سے زیادہ قریب تھا سوائے اس کے کہ وہ "تاریخ اور طبقاتی
شعور" میں ALIENATION کی جگہ پر REIFICATION کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ ان مخطوطات
میں مارکس نے شعوری رول پر کافی زور دیا ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ انتقادی خود آگاہی کی
ایک چنگاری ان غیر انسانی حالات پر جن میں پرولتاریہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت زندگی بسر کرنے
پر مجبور ہیں، آگ لگا سکتی ہے۔ پرولتاریہ کو آگاہ کرنے کے لیے جو انتقادی نظریہ وجود میں آتا ہے وہ
بہت جلد عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس طرح وہ محض خیال کی دنیا تک محدود نہیں رہتا۔
لوکاچ نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ مادے اور روح کی بحث کو روایتی زمروں میں محدود
کرنے کے بجائے اس سے ماورا جانا چاہیے اور یہ جدلیاتی طریقے سے اسی وقت ممکن ہے جب
ہم اپنے انقلابی نظریے کو عملی صورت دیں۔ عمل میں ہی ان کا ٹھوس اتحاد ممکن ہے۔ اس طرح ہم
دیکھتے ہیں کہ شعور لوکاچ کی مارکسی تعبیر میں ایک دوسرے ہی معنیٰ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ معنیٰ اس سے
بالکل مختلف ہیں جو ۱۹ ویں صدی کے اواخر میں ثبوتیتی سائنس نے طے کر دیئے تھے۔ خارجی
عمل کی انفعالی عکاسی کرنے کے بجائے اب وہ اس عمل کا وہ فعال حصہ تھا جو تاریخی حالت
(کلی جزوی نہیں) کی ماہیت ہی بدل دیتا ہے۔ بعض حالات میں خیالات کا انقلاب ایک زبردست
مادی قوت بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں۔ جسے مارکسی زبان میں انقلابی حالت کہتے ہیں۔ عمل
اور نظریے میں روایتی امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تاریخی اعتبار سے کلی لمحات ہوتے ہیں۔ معروض
خارجی حقائق اور موضوعی تعقل کے درمیان فرق مٹ جاتا ہے۔

چوتھا باب

لوکاچ کے فلسفے اور اُس سے متعلق نظریاتی تنازعات کو سمجھنے کے لئے ہمیں بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہوں میں سینٹرل یورُپ کی فلسفیانہ لہروں کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ لوکاچ کی کتاب HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی ایک معرکتہ الآرا کتاب تھی۔ اس کا سیاسی موقف بھلے ہی کمزور رہا ہو (ایک حد تک لوکاچ نے روزا لکزمبرگ اور لینن کے سیاسی موقفوں کے درمیان سے اپنا راستہ بنانے کی کوشش کی ہے) لیکن اس کی فلسفیانہ اہمیت سے مشکل ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ سینٹرل یورُپ کے ممالک اس زمانے میں ایک زبردست بحرانی دور سے گذر رہے تھے اور ایسے ماحول میں دانشوروں کا رُخ غیر عقلی فلسفوں کی طرف موڑنا بہت آسان تھا۔ OSWALD SPENGLER کی DECLINE OF THE WEST اور HEIDEGGER کی SEIN UND ZEIT (BEING AND TIME) جن کا یورُپ کے دانشوروں پر بڑا زبردست اثر پڑا انھیں اسی غیر عقلی رُجحان کی طرف لے گئیں۔ لوکاچ کا مارکس کے نظریئے میں جس پر تنومیت کا سایہ پڑ چکا تھا، ہیگلی سمت کو دریافت کر کے اُس پر زور دینا ایک بڑی اہم بات تھی۔ لوکاچ نے سائنسیت اور نواشینزم پر ایک ساتھ حملہ کر کے معاصر فلسفے کے اعصابی مرکز NERVE CENTRE پر زبردست چوٹ کی تھی۔ اگر جرمن اور آسٹرین کمیونسٹ اُس زمانے میں روس کے اندھے وفادار نہ ہوتے تو انھیں لوکاچ کی تصنیف میں اِسپینگلر اور ہائیڈیگر کے غیر عقلی فلسفے کا، جس نے سینکڑوں جرمن دانشوروں کو متاثر کر کے ٹھرڈ راغ کے لئے فضا ہموار کی، پُر اثر جواب مل جاتا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ اگر لوکاچ نے پوری طرح اخلاقی جرأت سے کام لیا ہوتا اور اسٹالنی دہشت سے خائف

ہو کر خاموشی اختیار نہ کی ہوتی یا اپنی INSIGHTS کو ترک نہ کیا ہوتا تو اس غیر عقلیت کے طوفان کو روکنے میں زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔

لوکاچ نے ہیگل پر زور دے کر سینٹرل یورپ کے دانشوروں کو مارکسزم پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مارکسزم نے سوویت مادیت کا روپ دھار کر ان دانشوروں کو مارکسزم سے ایک حد تک بیگانہ کر دیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ سوویت یونین ابھی فلسفے کے میدان میں ہم سے پچاس برس پیچھے ہے۔ لیکن لوکاچ نے مارکسزم کو دوبارہ ہیگل سے منسلک کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ لوکاچ اپنی تصنیف HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS پر ۱۹۶۷ء میں لکھے گئے پیش لفظ میں اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ بورژوا فلسفے میں اس دور میں ہیگل کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

مگر یہ رجحان ہیگل کے کانٹ سے انفصال کی اہمیت کو قطعاً نہیں سمجھ سکے اور دوسری طرف ان کی شعوری کوشش دلتھی کے اثر کے تحت یہ تھی کہ ہیگل کی جدلیات کو غیر عقلیت سے جوڑا جائے اس لیے لوکاچ نے اس دور میں اپنی اس کتاب کے ذریعے ہیگل کا صحیح رشتہ مارکس سے جوڑنے کی کوشش کی تاکہ ہیگل کی صحیح اہمیت بھی واضح ہو جائے اور مارکسزم بھی سینٹرل یورپ کے دانشوروں کے لیے قابل قبول ہو سکے۔ ہم نے اوپر کی بات بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وسطی یورپ کا اس دور میں سب سے اہم مسئلہ اخلاقی بحران کا مسئلہ تھا اور لوکاچ نے اسی اخلاقی مسئلہ کا حل مدِ نظر رکھ کر اپنا نظریہ تاریخ میں پیش کیا۔

نظریے اور عمل کا رشتہ

لوکاچ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، کانٹین فلسفے کی روایت میں پل کر جوان ہوا تھا اور کانٹین فلسفے میں اخلاقی زندگی اور نظریاتی معرفت میں ناقابلِ عبور خلیج پائی جاتی ہے۔ جو چیز اخلاقی طور پر فرض ہے اُسے ہم محض عقلی دلائل سے مستنبط نہیں کر سکتے کیونکہ مادی دنیا کو ہم سائنسی منطق کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر اخلاقی دنیا کو اس کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا۔ کانٹ نے اپنے فلسفے کے ذریعے یہ بھی تعلیم دی تھی کہ نیچر ناقابلِ تغیر علّی قوانین کے تابع ہے جبکہ فرد کی اخلاقی زندگی آزاد اور خود مقررہ اصولوں پر مبنی ہے۔ اخلاقی فیصلے فرد اپنے ضمیر کے مطابق کرتا ہے اور اس کا تعلق قطعی امر (ضمیر کا امر یا ربانی امر)۔ اپنے ساتھی انسان کی طرف فرض۔ سے ہوتا ہے اور ان کا جواز مظاہر کی دنیا سے ماورا ایسے عالم سے ہوتا ہے جو ہماری فہم سے بالاتر ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اخلاقی نظریے کا تعلق کسی معروضی اقدار کے پیمانے سے نہیں ہے جو خارجی حقیقت سے بندھا ہوا ہو۔ آزادی بھی مظاہر کی دنیا سے تعلق نہیں رکھتی اور اس لیے اس

کوئی جبلی پابندی عائد نہیں ہوتی ۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کانٹ کے فلسفے میں اخلاق کا تعلق (مثالی) IDEAL سے ہے ۔ یعنی کہ ایسا ہونا چاہیئے ۔ مگر ہے نہیں

لیکن ہیگل نے کانٹ کے اس اخلاقی نظریئے کو رد کیا اور اس معاملے میں دوبارہ ارسطو کی طرف رجوع کیا ۔ اس کے مطابق انسان اور کائنات کا تعلق مطلق سچائیوں سے ہے اور اسی لیے ہیگل کے فلسفے میں "ہے" اور "چاہیے" کے درمیان ناقابل عبور خلیج نہیں ہے ۔ اس لیے لوکاچ نے ہیگل کی طرف رجوع کرکے (اینگلس اور لینن نے ایک حد تک مارکسزم کی ثبوتیتی تعبیر کی تھی) کانٹ کے فلسفے میں جو حقیقت FACT اور قدر میں اور سائنس اور اخلاقیات میں امتیاز پیدا ہوگیا تھا، ختم کردیا ۔ لوکاچ نے اپنے مشہور مضمون REIFICATION AND THE CONSCIOUSNESS OF THE PROLETERIAT میں IS ہے ____ اور OUGHT (چاہیئے) کے فرق پر طویل بحث کی ہے اور کانٹ کی FACT VALUE والی ثنویت کو رد کیا ہے ۔ ایک مارکسی مفکر کی حیثیت سے لوکاچ کو اس قسم کے ہر نظریئے پر سخت اعتراض ہے جو خارجی حقیقت کو ناقابل تغیر (اور کانٹ کی طرح ناقابل فہم) سمجھ کر ایک مثالی اخلاقیات کی خیالی تخلیق کرے اور اس طرح جو موجود ہے اور جو ہونا چاہیئے اس میں ناقابل عبور خلیج پیدا کردے ۔ مارکسی جدلیات میں تو خارجی حقیقت اور موضوع میں ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت ہے اور SUBJECT-OBJECT - میں ایک جدلی رشتہ ہے ۔ اس لیے پہلے فلسفے میں عقل اور مادے، جسم اور روح، تعقل اور ایمان، آزادی اور جبر کو ایک دوسرے کی ضد ANTI-THESIS سمجھا جاتا تھا اور بڑھتے بڑھتے اس نے مطلق موضوعیت اور مطلق معروضیت کی شکل اختیار کرلی ہیگل کے فلسفے میں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اس کے برخلاف جدلیات پر زور ہے اور مطلق موضوعیت اور مطلق معروضیت سے انکار ۔ مارکس نے ہیگل کے جدلیاتی طریقۂ کار کو قبول کیا ہے ۔ مارکس خارجی حقیقت کو قابل تغیر قرار دیتا ہے اور یہ تغیر انسان کے عمل سے HUMAN PRACTIS پیدا ہوتا ہے ۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ SUBJECT- OBJECT میں باہم دیگر اثرانداز ہونے کا رشتہ ہے ۔ اس لیے کانٹ والی FACT- VALUE ثنویت مارکسی مفکر کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی ۔ خارجی حقیقت تو ناقابل فہم ہے نہ ناقابل تغیر ۔ پھر "ہے" اور "چاہیئے" میں کیونکر دیوار ہو سکتی ہے ۔

لیکن لوکاچ کے یہاں IS اور OUGHT کا مسئلہ اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا ہمیں نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں لوکاچ دو الگ علی سلسلوں کا قائل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے دلائل کا نچوڑ حسب ذیل ہے:

"کچھ علی سلسلے CAUSAL CONNECTIONS ایسے ہیں جو فوری اور طبعی علت کا کام کرتے ہیں اور کچھ علی سلسلے ایسے ہیں جو ایک خاص غایت کو مدنظر رکھ کر کی گئی۔ پہلی (TELEOLOGICAL INITIATIVE سے حرکت میں آتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی علی ضرورتی CAUSAL NECESSITY کو قائم رکھتے ہیں اب

میں سماجی ارتقا کے بنیادی علم الوجود ONTOLOGY کے مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ یہ مسئلہ اس حقیقت سے جڑا ہوا ہے کہ سماج ایک غیر معمولی پیچیدہ مرکبوں کا مرکب ہے جس میں دو متضاد قطب POLES ہیں۔ ایک طرف سماجی کلیت ہے (یعنی پورا سماج اپنی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ) جو بالآخر الگ الگ مرکبوں INDIVIDUAL COMPLEXES کا باہمی تعامل طے کرتا ہے اور دوسری طرف پیچیدہ فرد ہے جو ناقابل تقسیم چھوٹی سے چھوٹی وحدت ہے اس سماجی عمل میں یہ اقطاب باہمی تعامل سے عمل کا تعین کرتے ہیں اور اسی عملی سلسلے سے آدمی انسان بنتا ہے۔ اس لیے میں زور دے کر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ان مسائل پر معاشیاتی عوامل کا کتنا ہی اثر کیوں نہ ہو، یہ حقیقت کا روپ انسانی فیصلوں کے ذریعے ہی اختیار کرتے ہیں جو وہ مختلف صورتوں کے درمیان انتخاب کے ذریعہ کرتا ہے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ کانٹ کے اخلاقیات کے تصور کو رد کر کے ایک نیا جدلی تصور قائم کرتا ہے جس کی بنیاد ہیگل اور مارکس کے فلسفیانہ تصورات پر ہے۔ لوکاچ کے فلسفیانہ تصورات کئی بار اسٹالن کے دور کی راسخ العقیدگی ORTHODOXY سے ٹکرائے اور اسے کئی بار اپنے خیالات سے توبہ بھی کرنی پڑی۔ لوکاچ نے کبھی پارٹی کو عصمت کا درجہ نہیں دیا اور پارٹی لائن سے ہٹ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس بات پر لوکاچ کی بعض نقادوں نے کڑی تنقید کی ہے کہ پارٹی کے دباؤ کے سامنے اس نے گھٹنے ٹیک دیئے اور اس طرح "بزدلی" کا ثبوت دیا۔ لیکن اسے اس کی معاملہ فہمی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ آخر اس لڑائی میں اسے بھی ہر طرح کے داؤ پیچ استعمال کرنا پڑتے تھے۔ جورج لشتھائم نے لوکاچ کے فرانسیسی اور روسی ادب پر مضامین کے مجموعے STUDIES IN EUROPEAN REALISM جس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۵۰ میں شائع ہوا۔ مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ کس طرح لوکاچ کو پارٹی احکامات یا

روسی سیاست کی مصلحتوں کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔ اس مجموعے میں جو مضامین شامل ہیں وہ لوکاچ نے پروپیگنڈہ رسالوں میں اس دور میں لکھے جب فرانس اور سوویت یونین میں باہمی تعاون پر زور دیا جا رہا تھا۔ لشتھائم کہتا ہے کہ یہ مضامین کسی طرح تنقید کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور ان کے کم تر معیار پر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لشتھائم نے اس رائے کے اظہار میں لوکاچ سے کچھ زیادتی ہی کی ہے۔ اس کے مقابلے میں الفریڈ کازین کی رائے جو اس نے STUDIES IN EUROPEAN REALISM. کے ۱۹۶۴ والے ایڈیشن کے مقدمے میں لکھی ہے (میرلین پریس والے ۱۹۷۲ کے ایڈیشن میں کازین کا یہ مقدمہ شامل نہیں ہے) زیادہ صحیح ہے، زیادہ متوازن ہے۔ کازین کہتا ہے "لوکاچ کی "اسٹڈیز ان یوروپین ریلزم" — باوجود اس کے بعض حصوں کے جن میں وہ لینن اسٹالن مسلک CULT کے سامنے جھکتا ہے اور روسی ادبی روایت کی میکانکی قسم کی خوشامدانہ تعریف کرتا ہے (یہ کتاب چوتھے دہے میں لکھی گئی تھی جب خوفناک قسم کے مظہر کا عمل جاری تھا) — کا خاصّہ یہ ہے کہ یہ آج کے عظیم دور میں انسانی مقدر کی عظمت کا فلسفیانہ اور اخلاقی وژن پیش کرتی ہے۔ یہ کتاب انیسویں صدی کے حقیقت نگاری کے ذرائع کو ایک نئے اور ڈرامائی انداز سے فوکس میں لاتی ہے..... انیسویں صدی کی حقیقت نگاری کو پیش کرنے میں لوکاچ کی امتیازی حیثیت ہے کیونکہ وہ ایسا فلسفی ہے جس میں تنقیدی تجزئے کا زبردست جوہر ہے اور ساتھ ساتھ ایک ایسا ناقد ہے جو منطقی سختی کے ساتھ اپنے نکات پیش کرتا ہے۔" اسٹڈیز ان یوروپین ریلزم کا مطالعہ کم از کم مجھے کازین کی رائے سے اتفاق کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ ہم آگے چل کر اس مسئلہ پر اور بحث کریں گے اس بات کا لشتھائم بھی اعتراف کرتا ہے کہ اُن دنوں جب یہ مضامین لکھے گئے، لوکاچ اسٹالن کے بربری دور کا سامنا کر رہا تھا اور اس کی پوزیشن ہنگری کے ایک مہاجر کی حیثیت سے بڑی ہی نازک تھی۔ ان حالات میں اسٹالن کو خراجِ عقیدت پیش کیے بغیر صحیح نکلنا ممکنات میں سے نہیں تھا۔

لشتھائم خود اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ ۵۰-۱۹۴۹ء میں بھی لوکاچ پر بڑے گمبھیر قسم کے الزامات تھے۔ اس دور میں خاص طور سے ہنگری میں اسٹالن کی دہشت پسندی کا زوردار مظاہرہ ہوا۔ ہنگری کے کئی مارکسی دانشور اس خوفناک دور کا شکار ہوئے۔ لوکاچ پر شدید ترین حملہ خود اس کے ایک شاگرد JOSZEF REVAI جو لیٹر اسٹالنی تھا، نے کیا۔ ریوائی کے نزدیک لوکاچ کا بدترین جرم یہ تھا کہ اس نے روس کے
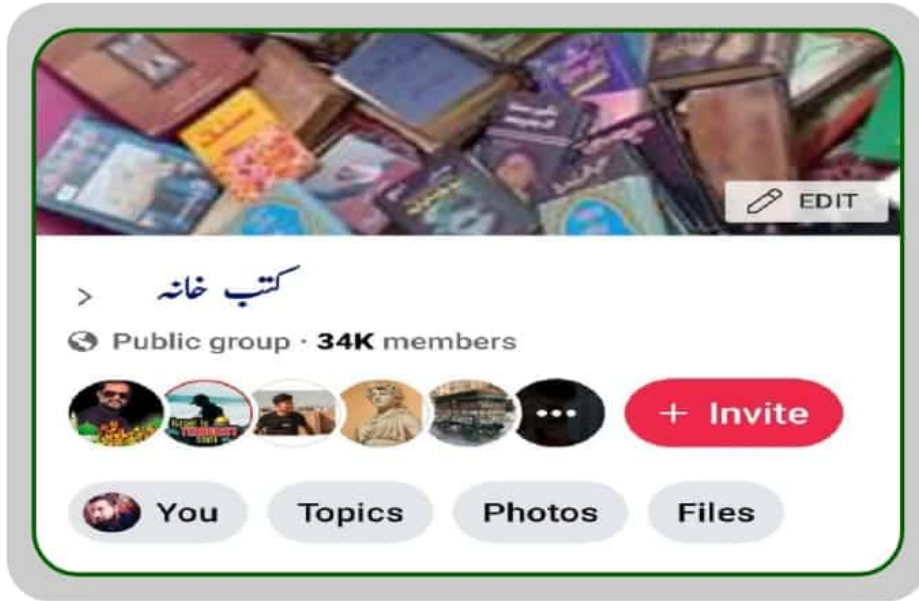
پانچویں دہے کے ادب کے متعلق مطلق خاموشی اختیار کرلی تھی۔ ریوائی کے نزدیک لوکاچ کی یہ بات بھی کچھ کم گمبھیر نہیں تھی کہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں اسٹالن نے بورژوا زوال پرستی اور سوویت تخلیقات کی تنقید کی تھی۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ لوکاچ "کلاسیکی بورژوا حقیقت نگاری کا مداح ہے؟ اور جوزیف ریوائی جیسے کٹھ ملاؤں کے لیے یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔ یہاں اس بات پر زور دینا مقصد ہے کہ لوکاچ ان دنوں بڑے ہی نازک دور سے گذر رہا تھا اور اسٹالنی ارتھوڈوکسی کے سامنے وقتی طور پر اس کا جھک جانا ایک حد تک ناگزیر تھا۔ ریوائی تو الزام تراشی میں اتنا آگے بڑھا کہ یہاں تک لکھ دیا:

"کامریڈ لوکاچ نہ صرف پچھلے پانچ برسوں میں بلکہ اس سے پہلے ہی سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کو بالکل فراموش کر چکے تھے۔ سامراج وادی زوال پرستی کے خلاف اپنی لڑائی میں وہ لوکاچ فاشزم کا مقابلہ قدیم روم کے عامیانہ اور مقبول عام انقلابی ہیتوں اور بورژوا جمہوریت کی روائتوں کو عام کرکے، ان کو دیومالائی اہمیت دے کر یا آدرش واد کا روپ دے کر کرنا چاہتے ہیں لوکاچ یہ سمجھتے ہیں کہ سامراجی حکومت میں ادب یا ادبی فکر اپنی خودمختاری کھو بیٹھتی ہیں کامریڈ لوکاچ کے ادبی نظریئے پر، جو سامراج وادی زوال پرست ادب اور فاشٹ نظریے کا عظیم بورژوا حقیقت نگاری سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے، 'عامیانہ جمہوریت' PLEBEIAN DEMOCRACY کے گہرے اثرات ہیں اور اسے استقامت پر مبنی نظام قرار دے کر اس طرف لوٹ جانے کی خفیہ خواہش پائی جاتی ہے۔"

لوکاچ پر یہ بڑا سنگین الزام تھا اور ہنگری کے اس ماحول میں جو ۱۹۴۹ء میں PARTY PURGES کے دوران پایا جاتا تھا، کسی شخص کو سخت ترین مصیبت میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اگر ان حالات میں لوکاچ نے کچھ ایسے مضامین لکھے جو تنقیدی معیار پر پورے نہیں اترتے (حالانکہ اس کے متعلق بھی دو رائیں ہو سکتی ہیں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا) تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ کئی دانشوروں نے جو ہر اعتبار سے لوکاچ سے کمتر ہیں، اس سے بڑھ کر سمجھوتے بازیاں کی ہیں۔ ویسے جورج لشتھائم جوزیف ریوائی کے لوکاچ پر اس الزام سے ایک حد تک اتفاق کرتا ہے۔ حالانکہ اسے اس کی تنقید کے کٹھ ملائی لہجے پر اعتراض ہے۔ یعنی کہ جورج لشتھائم یہ سمجھتا ہے کہ لوکاچ 'بورژوا حقیقت نگاری' کی طرف ایک خاص کشش رکھتا تھا۔ ازاک ڈائشر نے بھی ایک موقع پر اس کی طرف لوکاچ کی ٹامس من سے "ذہنی عشق بازی" کہہ کر اشارہ کیا تھا۔ اس میں لوکاچ کے شخصی

اور سیاسی ارتقا کو بھی بڑا دخل ہے۔ جب اس کی کتاب "تاریخ اور طبقاتی شعور" پر تنازعہ ختم ہوگیا تو لوکاچ نے ایک راسخ العقیدہ مارکس وادی لینن وادی بننے کی کوشش کی اور یہ نظر آنے لگا کہ اب وہ اپنے "آدرش وادی پر مبنی مسلک کو" چھوڑ کر اصل شاہراہ پر واپس آگیا ہے۔ یہ اس کی ۱۹۲۴ء والی لینن پر کتاب "بخارن کی "تاریخی مادیت"

پر محتاط تبصرہ اور اس کے MOSES HESS اور LASSALLE پر عالمانہ تبصرہ جو ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء میں لکھے گئے اس بات کے بین ثبوت ہیں۔ لوکاچ کی ان تحریروں سے اس کی سوشلسٹ تاریخ سے گہری واقفیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان تحریروں میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جو اسٹالن کے دور والے ماسکو میں قابلِ اعتراض سمجھی جاتی۔ لوکاچ کا MOSES HESS پر مضمون جس میں ہیگل کی "حقیقت پرستی" کا دفاع اور فختے کی آدرش وادی یوٹوپیائیت کی تنقید ہے۔ آج بھی معرکتہ الآرا سمجھا جاتا ہے۔ اس کو لوکاچ کی اہم ترین تحریروں میں سے ایک کہا جا سکتا ہے اور اس کی فلسفیانہ تصنیفات میں اتنی بلند معیار کی تصنیف مشکل ہی سے ملے گی۔ لوکاچ کی عمر اس وقت ۴۰ سال کی تھی اور اس کی تصنیفی اور تخلیقی قوت اپنے عروج پر تھی اور پھر اس پر وہ پابندیاں بھی نہیں تھیں جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے جرمنی میں ہٹلر کے اقتدار میں آنے سے پہلے وائیمر ریپبلک کا دور بہترین دور کہا جا سکتا ہے حالانکہ اس وقت بھی کمیونسٹ پارٹی جرمنی میں کئی گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ لوکاچ جیسے دانشور اور نظریہ ساز کے لیے یہ دور بڑا ہی موافق اور اہم دور تھا کیونکہ اس نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ اگر مارکسزم کو اکیڈمک دنیا میں نافذ کرنا ہے تو اسے اعلیٰ معیار کے علمی تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ جرمن کمیونسٹ پارٹی بعد میں بائیں بازو کی انتہاپسندی کا شکار ہوگئی اور اس کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ لبرل ازم کے جنازے پر سوار ہو کر ہٹلر نے اقتدار پر قبضہ جما لیا۔

لوکاچ نے ٹامس من کو جو ترقی پسندی کی طرف کھینچنے کی کوشش کی اسے اس پس منظر میں دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا اور خاص طور سے اگر ہم ۱۹۳۳ء کے سانحے کو مدِنظر رکھیں جب ہٹلر نے اقتدار پر قبضہ کیا۔ جرمن کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کے مقابلے میں لوکاچ کی فہم و فراست کہیں زیادہ گہری تھی اور وہ ان کے مقابلے میں جرمن کلچر اور تہذیب سے زیادہ واقفیت رکھتا تھا وہ ان لیڈروں سے اس بات کو زیادہ بہتر سمجھتا تھا کہ ۱۸ ویں صدی میں جرمن روشن خیال تحریک رجعت پرست تحریک کے ہاتھوں شکست کھا چکی تھی اور یہ کہ جرمنی کے تعلیم یافتہ لوگوں کا بھی بنیادی نظریہ غیر جمہوری تھا اور غیر عقلیت نہ صرف ایک خطرہ تھی بلکہ آنے والی قومی تباہی کا

پیش خیمہ بھی تھی۔ وہ اپنے نیم خواندہ پارٹی ساتھیوں کے مقابلے میں اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ قومی کلچر کا بنیادی رجحان جمہوریت اور مزدور تحریک کی بقا کے لیے کوئی غیر اہم بات نہیں تھی۔ اور لوکاچ نے اپنی بنیادوں پر کمیونسٹ تحریک کے متعلق اپنے نتائج اخذ کیے تھے۔

جرمنی اس دور میں یا اس سے کچھ قبل ایک عجیب مرحلے سے گذر رہا تھا۔ جرمنی ایک عرصے تک فرانسیسی انقلاب کے خلاف لڑتا رہا اور اسی جدوجہد میں اس کی قومی خودی آگاہی کی تشکیل ہوئی (حالانکہ کئی جرمن دانشور جن میں ہیگل بھی شامل ہے فرانسیسی انقلاب کے زبردست مداح تھے)۔ اپنے پڑوسی ملکوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ صنعتی ترقی کرنے کے باوجود اپنے قومی مزاج کے اعتبار سے سب سے زیادہ رجعت پرست تھا۔ ظاہر ہے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگلینڈ اور فرانس کے مقابلے میں جرمنی میں بورژوا نظام قدرے دیر سے قائم ہوا اور نتیجے کے طور پر بورژوا روایتیں وہاں سماجی اور سیاسی اعتبار سے اپنی جڑیں مضبوط نہیں کر سکی تھیں۔ سیاسی اور معاشی انقلاب اچانک قومی کردار پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ روس میں سوشلسٹ انقلاب کے بعد بھی ٹھیک یہی بات ہوئی۔ روس صدیوں سے زار کی مطلق العنانی کا عادی تھا اور صنعتی ترقی جس حد تک بھی روس میں رونما ہوئی تھی) سے محض سطحی تبدیلیاں ہوئی تھیں اور اس کی پیدا کردہ قدروں سے محض چند دانشور ہی صحیح معنی میں متاثر ہوئے تھے۔ روسی عوام کا کردار اس وقت تک زار کی روایتوں سے زیادہ متاثر تھا۔ ۱۹۱۷ء کا سماج وادی انقلاب اس کردار کو فوراً تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔

بورژوا انقلاب دیر سے رونما ہونے کی وجہ سے جرمنی بھی کچھ ایسے ہی کشمکش کے دور سے گذر رہا تھا۔ ۱۹۱۸ء کی شکست کے بعد جرمنی کے قومی منظر میں پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ گئیں۔ اس شکست سے جرمنی کے مزدوروں میں بھی تلخی پیدا ہوئی اور انتقام کا جذبہ ہر جرمن کے سینے میں پرورش پانے لگا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جرمنی میں اس دور کی سب سے زیادہ مقبول آئیڈیالوجی 'رجعت پرست رومانیت، جارحانہ فوج کشی کا جذبہ، طاقت کی پرستش اور لبرل، انسان دوست قدروں سے نفرت' وغیرہ جیسے عناصر کا مرکب تھی۔ جرمن کمیونسٹ پارٹی کے نیم خواندہ لیڈروں نے اپنی تنگ نظری اور کٹر پن کی وجہ سے ان عوامل کو نظر انداز کر دیا جن کا تجزیہ حالات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے بے حد ضروری تھا۔ لیکن لوکاچ چونکہ جرمن کلچر اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ لوکاچ نے جرمنی کا نظریاتی اور سیاسی تجزیہ کرتے وقت ان تمام باتوں کو مدِّ نظر رکھا۔ لوکاچ تو خیر گہری بصیرت کا مالک تھا اور اس کے لیے ان باتوں کو نظر انداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر تعجب تو کمیونسٹ پارٹی کی سمجھ پر ہے کہ اس نے ان تمام باتوں کو بالائے طاق رکھ کر بڑا ہی تنگ نظر رویہ اختیار کیا۔

جب تک نہیں بدل دیتا۔ سیاسی انقلاب رونما ہونے کے بعد ایک طویل عرصے
[illegible]

لوکاچ کے اسٹالنی مخالفوں نے اس پر فرانسیسی انقلاب کی ذہنی میراث کو دوبارہ زندہ کرنے کا الزام لگایا۔ اس الزام میں یقیناً سچائی تھی مگر لوکاچ کے مخالف اپنے تنگ نظر موقف کی وجہ سے یہ بھول گئے کہ جرمنی کے اس دور کے حالات میں لبرل عناصر کا ساتھ لینے کے لیے ہیومانزم اور لبرلزم پر زور دینا بھی ضروری تھا۔ جرمنی کا متوسط طبقہ بھی لبرلزم اور ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے پیدا کردہ جمہوری آدرشوں کو فراموش کر چکا تھا۔ ایسے ماحول میں سوشلزم کو قابل قبول بنانے کے لیے SECTARIAN موقف اختیار کرنے سے (جیسا کہ جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی نے کیا) زیادہ ضروری اس کی انسانیت دوست بنیادوں کو مقبول بنانا تھا۔ جرمنی کے اس دور کے حالات میں RADICAL HUMANISM کو پھیلانا جس کی نمائندگی گیورگ GEORG BUCHNER ہنرچے ہائنے (HEINRICH HEINE) نکولاوس لیناؤ اور لبرل اشرافی پلاٹین — جو لوکاچ کا خاص پسندیدہ تھا۔ وغیرہ کر چکے تھے، بہت ضروری تھا۔ ۱۸۳۰ سے لے کر ۱۸۴۸ تک کا دور جرمن تاریخ میں بہت اہم دور تھا۔ اسی دور میں جرمن فکر میں ایک نیا موڑ آیا اور جرمن شاعری میں انسان دوستی کا جذبہ ابھرا۔ جرمن فلسفے، ادب اور آرٹ کی کلاسیکی روایات جس میں گوئٹے، ہیگل اور بیتھوون شامل ہیں۔ ہر اعتبار سے قابلِ فخر ہیں۔ لوکاچ ٹامس من کو اس ہیومانسٹ ٹریڈیشن کا جز بنا کر معمولی پروپیگنڈہ کا کام نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اس طرح لبرلزم کی حدود کو وسیع بنیاد عطا کر کے مارکس اور اینگلس کو بھی جرمن کلاسیکی ادب کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔ ویسے دیکھا جائے تو لوکاچ کی یہ کوشش قابلِ تعریف قدم تھی کیونکہ اس کا سوشل ڈیموکریٹک پیشرو فرانز مہرنگ (1846-1919) جو مارکس کا سوانح نگار اور ادبی نقاد تھا، جرمنی کی لبرل مڈل کلاس کے ایک چھوٹے سے حصے کو ہی مشکل سے سوشلزم کی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ لوکاچ نے وہاں سے شروع کیا جہاں تک فرانز مہرنگ پہونچا تھا۔

لوکاچ جس نے فلسفیانہ روایت میں ذہنی تربیت حاصل کی تھی۔ نظریاتی بالائی عمارت کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل جرمن کلچر کے پیش منظر میں فیصلہ کن جنگ شعوری سطح پر دو متضاد لہروں کے درمیان لڑی جاتی تھی۔ ایک طرف عقلیت پسندی اور انسان دوستی کی لہر تھی۔ اور دوسری طرف عقلیت دشمنی اور بربریت کی لہر۔ سیاسی سطح پر اہلِ دانش کی حمایت حاصل کرنے کے لیے عقلیت پسندی اور انسان دوستی کی طرف انہیں مائل کرنا بہت ضروری تھا لیکن ایسے دانشوروں کی حمایت محض پروپیگنڈہ مواد اس کے کانوں سے بار بار ٹکرانے کی وجہ سے

نہیں حاصل ہوسکتی۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب تبدیلی انسانی یقین میں دل سے ہو،
اور اس کے پیچھے ایک مشترکہ مقصد کا جذبہ کارفرما ہو اور یہ مشترکہ مقصد تھا جرمن کلاسیکی روایتوں کا دوبارہ
احیاء۔ لیکن افسوس کہ یہ جرمن کلاسیکی روایت جرمن فوجی جارحیت میں ڈوب کر رہ گئی۔ اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت بھی جرمنی کے رومانی طوفان اور جذبات میں بہہ گئی۔ اور اس کے زیر اثر اس نے
ہٹلری بربریت کا روپ دھار لیا۔ نیٹشے اور اس کی فاشسٹ ذہنی اولاد نے جرمن قدیم
اور کلاسیکی روائتوں کو بربری شکل دے دی اور اس کا جو خطرناک نتیجہ ہوا وہ اب یورپ کی تاریخ
کا سیاہ ترین حصہ بن چکا ہے۔

لیکن لوکاچ کی ذاتی کوششیں اس اہم کارنامے (یعنی جرمن لبرل، جمہوری اور انسان
دوست روائتوں کا احیاء) کو انجام دینے کے لیے ناکافی تھیں۔ یہ کام جرمن کمیونسٹ پارٹی کے
اشتراک سے ہی ممکن ہوسکتا تھا اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، جرمن اور آسٹرین کمیونسٹ پارٹی
کے اراکین اپنے جامد عقیدے اور تنگ نظر موقف پر اڑے ہوئے تھے اور ایسے کسی کام کے لیے ذہنی
طور پر تیار نہیں تھے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد یہ تنگ نظری اور نظریاتی جنون کمیونسٹوں میں بڑھتا ہی گیا۔
اسٹالن کی تحریروں سے اقتباسات پیش کرکے یہ گروہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ جرمنی دراصل انقلابی
دور میں داخل ہونے کے لیے ہر طرح سے تیار ہے اور اسی غیر متوازن تجزئے کا نتیجہ تھا کہ جرمنی کے
ان مارکسی نظریہ سازوں نے شوسل ڈیموکریسی اور فاشزم کو "جڑواں بچے" قرار دے دیا۔ زینو ویو
اس قسم کا نیم پاگل پن کا نظریہ ۱۹۲۴ سے پھیلا رہا تھا اور اسٹالن اور اس کے ساتھیوں نے
بعد میں اسے اپنا لیا۔ لوکاچ مشکل ہی سے اس نظریاتی جنون کا مقابلہ کرسکتا تھا اور آخر مجبور
ہوکر اس نے ہتھیار ڈال دئے اور ۱۹۳۱ء کے بعد اسے بھی ماسکو سے ملنے والی ہدایات کے
مطابق پروپیگنڈا مہم میں شریک ہوتے ہوئے جو ذہنی تکلیف ہوگی اس کا ہم اچھی طرح اندازہ
کرسکتے ہیں۔

ظاہر ہے ایسی حالت میں لوکاچ کی ٹامس من اور دوسرے مصنفوں کو ترقی پسندوں کے
کاز کے لیے کارآمد قرار دینا یا تو فضول سی بات سمجھی جاتی تھی یا محض سیاسی چال۔ لوکاچ کو انہی
سیاسی مجبوریوں کے تحت یہ کہنا پڑا کہ آرٹ اور پروپیگنڈا میں فرق کرنا ٹراٹسکی کے نقطہ نظر کی حمایت
کرنا ہے۔ فرانز مہرنگ نے ایک بار بڑی سچ بات کہی تھی کہ انقلابی دور جمالیاتی تخلیقات کے
اعتبار سے کچھ بہت کارآمد ثابت نہیں ہوتا کیونکہ گڑبڑ اور افراتفری کے ایسے دور میں جمالیاتی
معیار پر توجہ دینا بڑا مشکل ہوتا ہے، بلکہ ناممکن۔ ایسے غیر معمولی حالات میں یہی کوشش

ہوتی ہے کہ اپنی بات کسی طرح زیادہ سے لوگوں تک پہونچائی جائے۔ ٹرائسکی نے ۱۹۲۳ میں کہا تھا کہ مستقبل کے سوشلسٹ سماج میں جہاں سوشلسٹ کلچر ہوگا، بورژوا تحریروں اور پرولتاری لٹریچر میں امتیاز کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی یعنی کہ فن کو فنی معیار سے جانچنا ہوگا، محض نظریاتی اعتبار سے نہیں۔ ۱۹۳۲ تک ٹرائسکی کی یہ بات لعنت ملامت کا شکار تھی لیکن چند برسوں بعد فن کا یہی نظریہ سرکاری طور پر قبول کر لیا گیا۔ اور اس کے نتیجے میں لوکاچ کو بھی اپنا موقف بدلنا پڑا۔ لوکاچ پرولتاری ادب کی بجائے اب سوشلسٹ ریلزم کے تصور کو عام کرنے لگا جسے اسٹالن نے میکسم گورکی کے مشورے پر سرکاری حیثیت دے دی تھی۔

چونکہ اسٹالنی دور میں لوکاچ کو سیاسی دباؤ کے تحت بار بار اپنا موقف بدلنا پڑا، یہاں لوکاچ کی ادبی اور سیاسی تحریروں میں تسلسل یا اس کی غیر موجودگی کا جائزہ لینا مناسب ہوگا حالانکہ ہم تفصیل سے اس پر گفتگو نہیں کر سکیں گے۔ 1908 - 1910 کے درمیان لوکاچ نے فن اور جمالیات سے متعلق جو مضامین تحریر کیے وہ THE SOUL AND THE FORMS کے نام سے شائع ہوئے۔ ان مضامین کی اپنی اہمیت ہے اور نقادوں نے اسے لوکاچ کی نوعمری کا بڑا ہی حساس کارنامہ قرار دیا ہے۔ ویسے ان مضامین میں ہمیں قدم قدم پر تلمیحات، اور خیالات کی پیچیدگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان مختلف مضامین کو پڑھ کر ہمیں نہ صرف ایک تسلسل بلکہ ایک قسم کی خیال کی وحدت کا احساس ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے ہم نے مختلف مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک کتاب پڑھی ہے۔ ان ابتدائی مضامین میں ــــ اور ان مضامین میں بھی جو AESTHETIC CULTURE کے نام سے جمع کیے گئے۔ ان مضامین کو پڑھ کر ایسا لگتا کہ مصنف اڑان کے لیے پر تول رہا ہے۔ اور ابھی اس پر اپنی واضح خارجی پوزیشن طے نہیں کی۔ ہمیں یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس کا ترکیبی مرکزی خیال ــــ جو ایک مبہم سے وجدان اور ناقابل بیان معروضیت کی خواہش کا روپ اختیار کرتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ابھر رہا ہو۔ ہم ایک ہزار مختلف رشتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں مگر پھر بھی کسی ایک حقیقی تعلق کو اپنی گرفت میں نہیں لے پاتے۔ ہماری روح کے مناظر کا کہیں وجود نہیں ہے۔ پھر بھی ان مناظر میں ہر درخت، ہر پھول ٹھوس وجود رکھتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، لوکاچ کے یہاں OUGHT (چاہیئے) اور

(ہے) IS / میں ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں، جب لوکاچ مارکسی فکر سے آشنا نہیں تھا۔ اس ٹکراؤ کا حل اپنے طور سے پیش کرتا ہے۔ اس حالت میں ظاہر ہے کہ لوکاچ کا حل محض یک طرفہ رہتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اس ٹکراؤ کا چیلنج نمودار ہو چکا ہے ویسے یہ بات الگ ہے کہ اس کا سامنا کرنے کی کیا تجویز ہو سکتی ہے۔ اس ابتدائی تصنیف میں ہمیں یہ احساس ابھرتا نظر آتا ہے کہ محض اقدار کی سطح پر اس کا حل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ خود لوکاچ کوئی مکمل حل تجویز نہیں کر پاتا پھر بھی وہ اپنی اس شکست کے باوجود فتح مند نظر آتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اصل مسائل کو اپنی توصیفی نوعیت کی اعتبار سے ٹھوس سوالات کے اعلیٰ کمپلیکس میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اب ہم اس کی دوسری اہم تصنیفات THE THEORY OF THE NOVEL کی طرف آتے ہیں جو ھاـ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ اس کی دوسری اہم تصنیف ہے۔ اصل میں یہ ایک بہت ہی اہم اور زبردست تصنیف کی تمہید کے طور پر لکھی گئی تھی لیکن یہ کام آج تک مکمل نہیں ہو سکا (آج بھی اس کے مسودے کے سینکڑوں صفحات غیر مطبوعہ موجود ہیں کیونکہ اس باقاعدہ ایک سسٹم کے تحت پیش کرنا کارے دارد کا مضمون ہے) THE THEORY OF THE NOVEL اپنی ہیئت کے اعتبار سے SYSTEMATIZATION کا احساس ضرور پیدا کرتی ہے۔ مگر اس کے باوجود بنیادی طور پر وہ مقالاتی ہیئت سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ THE THEORY OF THE NOVEL میں لوکاچ اپنے ابتدائی مقالاتی ہیئت کو امکانی حدود تک لے جاتا ہے اور اس طرح وہ اس ہیئت کی تکمیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی اس تصنیف میں وہ اپنی پہلے کی تصانیف کے مقابلے میں اعلیٰ سطح کے مرکب مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ یہ کوشش اسے یقینی طور پر اپنے ارتقائی سفر میں اس ہیئت کے ماورا لے جاتی ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ THE THEORY OF THE NOVEL موضوعیت کے حدود میں قید نہ ہونے کے باوجود اب تک طریقہ کار METHODOLOGY کی غیر شخصیت، جو معروضی کلیت سے معین ہوتی ہے کو شعوری طور پر قبول کرنے کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ THE THEORY OF THE NOVEL اس کی تصنیفات سے آگے قدم ہونے کے باوجود موضوعیت سے پوری طرح نجات حاصل نہیں کر پائی۔ دراصل یہ موضوعیت اور معروضیت کے درمیان کی

منزل ہے اور اس نے ان لوگوں کے لیے دیو مالائی حیثیت اختیار کرلی ہے جو نظریاتی اعتبار سے سرمایہ دارانہ جہنم اور یوٹوپیائی سماج وادی جنت کے درمیان " ذہنی اعراف " کو اپنی منزل تصور کرتے ہیں۔ نیا عالمی دور جو THE THEORY OF THE NOVEL کے افق پر نمودار ہوتا ہے، ایک مبہم وجدان سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اسے ہم زیادہ سے زیادہ —— OUGHT-RIDDEN (چاہتے ہوئے سے بھرا ہوا) سوالیہ نشان قرار دے سکتے ہیں۔

لوکاچ کہتا ہے کہ :

" وہ عمل جو ناول کی داخلی ہیئت مقرر کرتا ہے فرد کا خود اپنے اندر تک سفر ہے، یہ راستہ ہے مایوس کن موجود حقیقت کی قید سے جو فرد کے لیے بے معنی اور اصل ذات سے ہٹی ہوئی ہے نکل کر ذاتی علم تک جو واضح پہنچنے کا جب یہ علم ذات حاصل ہو جاتا ہے تو وہ آدرش جو دریافت ہوتا ہے، یہ سچ ہے، ہمیں اپنی زندگی کے بیچ و بیچ زندگی کے اصل معنی کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے لیکن ہے، اور چاہیئے، کے درمیان خطِ فاصل سے ماورا جانا ممکن نہیں ہو پاتا اور ناول کی زندگی کے حلقے میں رہ کر اس کے ماورا جانا ممکن بھی ہو سکتا ہے۔"

لوکاچ کا یہ مسودہ سینکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ خود لوکاچ اسے منطقی نتیجے پر نہیں پہونچا سکا۔ اس کے متعلق وہ خود کہتا ہے کہ سرطان کے مرض کی طرح پھیلتی ہوئی اس تصنیف کو کسی منزل تک پہونچانا مشکل ہے۔ لیکن اس نہ ختم ہونے والے مسودے کی بھی لوکاچ کے لیے ایک خاص اہمیت تھی۔ اس نے اس کے شعور میں اور گہرائی پیدا کر دی۔ کسی منطقی نتیجے پر نہ پہونچ پانے کے باوجود اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ صحیح راستے پر ہے۔ وہ خود اس بات میں وشواس رکھتا تھا کہ ذہن میں پیدا ہونے والے خیال کو بیچ راستے میں مت چھوڑو بلکہ اسے دیوار سے سر ٹکرانے کی انتہا تک لے جاؤ۔ دیوار سے سر ٹکرانے سے پیدا ہونے والی چنگاریاں تمہیں بتلائیں گی کہ تم آخری حدود تک پہونچ چکے ہو۔ لوکاچ نے ایسی چنگاریوں کی شدت جتنی اس نامکمل تھیسس SYN THESIS کو لکھنے کے دوران محسوس کی اتنی پہلے کبھی نہیں کی لیکن اس کے باوجود اس نے ہیگلی جدلیات کے مختلف طبقات CATEGORIES کو ہر سمت میں پوری طرح آزمانے کی کوشش کی۔ اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ CATEGORIES ایک خاص پیچیدہ تاریخی صورتِ حال کو سمجھانے کے لیے کتنے ناکافی ہیں کہ اپنے وقت کے ایک بڑے دماغ کو ان سے پوری طرح مدد نہیں مل سکی۔ یہ مسودہ اور کچھ

نہیں تو اسی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

لوکاچ کا یہ ذاتی اور ذہنی بحران پہلی عالمی جنگ کے دوران اور اس کے بعد رونما ہونے والے ڈرامائی واقعات سے ایک حد تک حل ہو سکا۔ اکتوبر کا انقلاب، آسٹرو ہنگیرین ملوکیت کا خاتمہ اور سیاسی اور معاشی بحران کا اچانک اُبھر آنا اس اعتبار سے اہم ہیں۔ لوکاچ نے اس انقلاب کا خیر مقدم کیا اور اسے "نیا عہد" قرار دیتے ہوئے نئی ٹھوس مادی قوت کو پہنچانا۔ لوکاچ نے اس نئی صورت حال سے عظیم توقعات وابستہ کیں، اور کچھ جلد بازی اور بے چینی سے اس کا از سرِ نو نظریاتی جائزہ لیا۔ اس نے جس طرح ہنگری کی کمیونسٹ پارٹی اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اتحاد کا استقبال کیا وہ اس کے اس دور کی ذہنی حالت کی غماز ہے:

"آج (متحدہ پارٹی) متحدہ پرولتاریہ کی متحدہ خواہش کا اظہار ہے۔ یہ اس خواہش کا عملی عضو ہے جسے نئے سماج کی نئی قوتوں نے جنم دیا ہے۔ سماج واد کا بحران جس کا اظہار دو طرح کی مزدوروں کی جماعتوں کی جدلیاتی اختلافات سے ہوتا تھا۔ آخر ختم ہو گیا پرولتاریہ تحریک آخر کار ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے جو اس کے اقتدار میں آنے کا مرحلہ ہے۔ ہنگری کے پرولتاریہ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عالمی انقلاب کو اس نئے مرحلے تک پہونچایا۔ روسی انقلاب نے دکھا دیا ہے کہ پرولتاریہ طبقہ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک نئے سماج کی تنظیم کر سکتا ہے۔ ہنگری کے انقلاب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ انقلاب بھائیوں میں آپسی خون خرابے کے بغیر ممکن ہے۔ اس سے عالمی انقلاب آگے بڑھتے ہوئے ارتقائی مرحلے میں پہونچ گیا ہے۔"

لیکن لوکاچ کی یہ پر نشاط ذہنی کیفیت جلد ہی ختم ہو گئی۔ ہنگری کا انقلاب المناک انجام کو پہونچا۔ لوکاچ نے خاموشی اختیار نہیں کی بلکہ اپنے ذہنی قوت کو مجتمع کر کے پوری شدت کے ساتھ اس کا فلسفیانہ جائزہ لیا جو ______ HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ یہ لوکاچ کا ہر اعتبار سے قابلِ فخر کارنامہ ہے جس میں اس نے بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مارکسزم کا جائزہ لیتے ہوئے اسے ایک حد تک اینگلس کے ثبوتی اثر سے آزاد کرا کر ہیگلی اور مارکسی جدلیات کی طرف لوٹایا۔ لوکاچ نے اس تصنیف میں فلسفیانہ مسائل کے علاوہ ٹھوس تنظیمی اور سماجی اداروں کے مسائل سے بھی بحث کی ہے۔

"مزدوروں کی کونسل سرمایہ دارانہ عہد کے مارکسی ادب میں اس کی جگہ ALIENATIOR کی اصطلاح رائج ہوئی ہم REIFICATION (مجرّد تصوّر کا ٹھوس شکل اختیار کرنا) پر سیاسی اور سماجی فتح ہے۔ ڈکٹیٹرشپ کی صورت ختم ہونے کے بعد اسے قانونی ۔ عاملہ اور عدلیہ کے فرق جو بورژوا سماج میں پایا جاتا ہے ۔ قابو حاصل کرنا چاہئیے ۔ اسی طرح اقتدار کی جنگ میں یہ (یعنی کہ مزدوروں کی کونسل) پرولتاریہ کی زمانی و مکانی اعتبار سے اجزا ہیں ۔ تقسیم کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور معاشیات و سیاست کو ایک ساتھ ملا کر صحیح معنی میں پرولتاریہ کے عمل میں سچا اتحاد پیدا کرنا بھی اس کے فرض میں شامل ہے اور اس طرح یہ انتہائی مقصد اور فوری مفاد کے جدلی اختلافات میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے۔"

تیسرے دہے میں لوکاچ نے ایک طرف عملی سیاست میں سرگرم حصّہ لیا تو دوسری طرف فلسفیانہ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا ۔ سیاست میں جیسا کہ ہم پہلے کچھ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں لوکاچ کو گوناگوں حالات کا سامنا کرنا پڑا اور کامنٹرن کی طرف سے اس پر پے در پے حملے ہوتے رہے خاص طور سے بلوم تھیسیس کے بعد ان حملوں میں بڑی شدّت پیدا ہوگئی اور مجبوراً لوکاچ کو عملی سیاست سے ایک حد تک کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی ۔ اس دوران میں لوکاچ نے اپنا زیادہ تر وقت مطالعے اور تصنیفی کام میں گذارا ۔ اسی عرصے میں اس نے بخارن ، لاسال اور ولس ہیس پر مضامین لکھے ان مضامین میں سیاسی معاشیات کا عنصر بتدریج بڑھتا ہوا نظر آتا ہے ۔

لوکاچ کی اس دور کی دوسری معرکۃ الآرا تصنیف YOUNG HIGEL ON THE RELATION BETWEEN DIALECTIC AND ECONOMICS. نوجوان ہیگل ، جدلیات اور معاشیات کے درمیانی رشتے پر ہے اس تصنیف میں بھی سیاسی معاشیات کا عنصر البتہ غالب نظر آتا ہے ۔ حالانکہ اس تصنیف کا مرکزی خیال موسیس ہیس والے مضمون اور "آدرش وادی جدلیات کے مسائل میں موجود ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ کی تصنیفات اور مضامین ہیں ، مارکسی نظریہ قبول کرنے سے پہلے اور بعد میں ، تسلسل بھی نظر آتا ہے اور عدم تسلسل بھی ۔ ویسے یہ طائرانہ جائزہ تشفی بخش تو نہیں کہا جا سکتا مگر ایک حد تک ہم لوکاچ کی تصانیف میں تسلسل اور عدم تسلسل کے مسئلے سے واقف ضرور ہو جاتے ہیں ۔

پانچواں باب

ٹامس من سے لوکاچ کے ذہنی معاشقے کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں اس کا ہم کچھ تفصیل سے جائزہ لیں گے۔ لوکاچ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ٹامس من کا بڑا مداح تھا لوکاچ کا من کی طرف یہ جھکاؤ دراصل ۱۹۱۲ سے پہلے سے تھا۔ جب وہ ہنگری میں مقیم تھا۔ اس کا یہ جھکاؤ اس کے ماسکو میں طویل قیام ۱۹۳۳ - ۱۹۴۴ کے دوران بھی باقی رہا۔ یہ دور روس میں بڑی تنگ نظر SECTERIAN سیاست کا دور تھا۔ ۱۹۵۳ کے بعد جب اس کی شدت میں کمی ہوئی تو لوکاچ قدرے زیادہ آزادی سے من کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا۔ ویسے جب من فاشزم کے خلاف مقاومت میں حصہ لے رہا تھا، لوکاچ شروع سے آخر تک من کی تلاش میں لگا ہوا تھا۔ بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوکاچ شروع سے آخر تک من کی طرف راغب رہا اور ادبی نقاد کی حیثیت سے اس کے فن کا معترف رہا۔

ٹامس من سے لوکاچ کی ملاقات ۱۹۰۹ء میں ہوئی جب اس نے من کے ناول ROYAL HIGHNESS پر تبصرہ کیا تھا۔ یہ تبصرہ لوکاچ کی ۱۹۶۴ء میں شائع شدہ کتاب ESSAYS ON THOMAS MANN میں ضمیمے کے طور پر شامل ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم مضمون "بورژوا انسان کی تلاش میں" ہے جو لوکاچ نے ۱۹۴۵ میں ٹامس من کی ۷۰ ویں سالگرہ کے موقع پر لکھا تھا۔ خود لوکاچ کے الفاظ میں "اس مضمون میں من کے متوسط طبقے کی طرف، جو میرے خیال میں اس کے (یعنی کہ من کے) کیریر کا سماجی اور شخصی سطح پر فیضان کا ذریعہ ہے، جدلیاتی اعتبار سے پیچیدہ رجحان کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے ٹامس من اس متوسط طبقے کا نمائندہ تھا اور اس طبقے کی طرف اس کا رجحان، جیسا کہ لوکاچ کہتا ہے، "جدلیاتی پیچیدگی" کا حامل تھا۔ یہاں متوسط طبقے کے لفظ سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس

لیے اس کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ اس سے مراد آج ہمارے دور کے سرمایہ دارانہ
سماج کے متوسط طبقے سے نہیں ہے۔ دراصل اس کے لیے جرمن لفظ BURGERTUM
ہے جو اب قدیم تصورات میں شمار ہوتا ہے۔ جس کا زیادہ مستعمل اصطلاح بورژوازی سے دور
کا رشتہ ہے لیکن یہ اس سے قدرے مختلف بھی ہے۔ دراصل یہ جرمنی کا وہ طبقہ ہے جس
نے ۱۶ ویں صدی کے شروع میں شہری ریاستوں میں ایک خاص کلچر پیدا کیا اور یہ طبقہ ہمیشہ اپنے آپ
کو ایک ممتاز طرز زندگی کا حامل سمجھتا رہا جو ایک طرف جرمن اشرافیہ سے مختلف تھا تو دوسری طرف
عام آدمیوں سے۔ اس طبقے کی اپنی قدریں تھیں جن کو BILDUNG کہتے تھے اس کا ترجمہ انگریزی یا
اردو میں آسانی سے نہیں کیا جا سکتا — جسے ہم ایک طرح سے عقلی اور اخلاقی پختگی کہہ سکتے
ہیں، اس طبقے کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ اس طبقے کے افراد کے لیے محض ملکیت حاصل کر لینا
کافی نہیں سمجھا جاتا تھا حالانکہ اس کا ہونا ذاتی وقار میں اضافے کا باعث ہی ہوتا تھا بلکہ اس کے
ساتھ ساتھ ان تہذیبی قدروں کو حاصل کرنا اور برتنا بھی بہت ضروری تھا۔ ان قدروں کا عروج
ہمیں وائمر کے اس کلاسیکی کلچر میں نظر آتا ہے جو گوئٹے اور شیلر جیسے سحر انگیز ناموں سے وابستہ
ہے۔ اس میں نوولس رومانوی اور شلیگل جیسے رومانوی شاعر بھی شامل ہیں۔ ہر وہ شخص جو
اس کلچر سے واقف نہ ہو غیر مہذب سمجھا جاتا تھا۔ اور وہ BUKGEK ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا
اس طبقہ میں خاص طور سے سیول سرونٹس یونیورسٹی ٹیچرز، چرچ کے عہدیدار یا مبرل پیشوں
کے افراد کا شمار ہوتا ہے۔ اس طبقے کو چھوٹی بورژوا KLEINBURGEK سے جو چیز ممتاز
کرتی تھی وہ تھی اس کی زندگی کا اسٹائل جو چند آدرش قدروں کے آس پاس گھومتا تھا۔

ٹامس مَن اسی طبقے اور کلچر کا عظیم نمائندہ تھا۔ اس لیے تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس
نے لوکاچ جیسے دانشور کو اپنی طرف راغب کیا۔ مَن نے پہلی عالمی جنگ میں حب الوطنی کا
جو موقف اختیار کیا لوکاچ کو اس سے صدمہ پہونچا اور ان کے آپسی تعلقات کی گرمجوشی ختم ہو
گئی لیکن یہ سرد مہری کی کیفیت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی۔ دونوں میں جو قدر مشترک
تھی اور جس کا لوکاچ نے خود بعد میں ماسکو میں اقرار کیا وہ تھی سرمایہ داری کی رومانوی مخالفت
جہاں تک شخصی عقائد کا سوال ہے ۱۹۱۴ سے پہلے تو لوکاچ مذہبی وجودیت کا قائل تھا۔

(یہ دلچسپ بات ہے کہ ٹامس مَن کے مشہور ناول MAGIC MOUNTAIN
میں (NAPHTA) نام کا کردار ہے جو ایک طرف جیسوئیٹ ہے اور عیسائیت
میں اعتقاد رکھتا ہے اور دوسری طرف پرولتاری انقلاب کا بھی حامی ہے دراصل یہ کردار مَن

نے لوکاچ کو ذہن میں رکھ کر ہی وضع کیا ہے۔) اور جرمن صوفیوں) اور خاص طور سے مشہور مذہبی وجودی کرسکے گارڈ اور روسی وجودی ادیب دوستوفسکی میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ لوکاچ کو مَن کا رومانوی طنزیہ انداز پسند نہیں تھا اور یہ بات اس کی ناقابل حصول المیہ طربیہ خواہشوں کی وجہ سے ہے ایسی خواہشات جب زندگی کے تلخ حقائق سے ٹکراتی ہیں تو انسان میں تنہائی اور علیحدگی کا احساس پیدا کرتی ہیں اور یہ اس کی زندگی کا المیہ بن کر رہ جاتا ہے لوکاچ اس صورتِ حال سے بھی اچھی طرح واقف تھا جس کی وجہ سے BURGER طبقے کی طرف مَن کا رویہ پیدا ہوا تھا۔ لوکاچ لکھتا ہے، " اس کی (مَن کی) تحریروں میں وہ غالب ہوتے ہوئے بورژوا اشرافیہ وقار کا احساس ملتا ہے، وہ وقار جو دولت کی آہستہ روی سے پیدا ہوتا ہے !

لوکاچ خود مارکسزم کی طرف جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، دلتھی اور سمیل کے حیوی فلسفے LEBENSPHILOSOPHIE کی معرفت آیا۔ اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے مَن کی تحریروں میں بورژوا طرزِ زندگی سے بے اطمینانی کے آثار تلاش کرنا شروع کر دئے۔ مَن کی ابتدائی تحریریں (اسے اصطلاحی طور پر NOVELLA کہتے ہیں) اس مسئلے پر بحث کرتا ہے ۔ لوکاچ اپنے اسکول کے دنوں میں ہی اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن اپنی پختہ عمر میں لوکاچ نے بہت مختلف موقف اختیار کیا۔ اب وہ اس کانشین (یا فاوسٹ کی طرح فرد کا قائل ہو چکا تھا جو محض سوچ میں ڈوبا ہوا وجود بسر کرنے کے بجائے اس دنیا کو تبدیل کرنا چاہتا ہو۔ ساتھ ساتھ چونکہ لوکاچ جمالیات سے گہری وابستگی رکھتا تھا وہ مَن کی تخلیقات کی اہمیت کو سیدھے سادے سماجیاتی نظریات تک محدود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ٹامس مَن ایک طرح گوئٹے کا فنی وارث تھا۔ اس نے اپنے طویل فنی کیریر کے آخر میں (BILDUNGS ROMAN اس تہذیبی ماحول کا ناول جس کا علمبردار جرمن متوسط طبقہ تھا جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) لکھا اور اس کا نام بھی اسی مناسبت سے ڈاکٹر فاوسٹس رکھا اکثر تفصیل سے لکھ چکا تھا اور اب ۱۹۴۵ میں جب مَن کا یہ ناول اس کے سامنے تھا اس نتیجے پر پہونچا کہ مَن گوئٹے کا جائز وارث تھا۔ لوکاچ اپنے (ESSAYS ON THOMAS MANN) میں لکھتا ہے :

" ٹامس مَن کی تحریروں میں ہمیں بورژوازی جرمنی کا نقشہ دیکھنے کو ملتا ہے اور اس کے ساتھ ہی زمانے کی اس رفتار کا جس میں مقدم اور موخر سب کچھ شامل ہے انہی کے ذریعہ ہمیں ان داخلی مسائل کا عرفان حاصل

۷۔ آرٹ اور زندگی کے پیچ یا ہمی مسئلے کے اس پاس گھومتی ہیں مَن کا مشہور مختصر ناول انگریزی میں

ہوتا ہے جنہیں بڑی چابکدستی کے ساتھ گرفت میں لیا گیا ہے ۔ ان مسائل کے ذریعے مستقبل کی جانب منطقی انداز سے اشارہ کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ آج کے دور کی حقیقتوں میں وہ ہمارے سامنے کسی خیالی مستقبل کا طلسم نہ کھڑا کر دیں اس طرح کی حقیقت پسندانہ تحریریں شاذ ہی ایسی ہوں گی جن کی تشکیل اس انداز پر کی گئی ہو .... من اور گوئٹے کے درمیان خواہ کتنی ہی یکسانیت کیوں نہ ہو ایسے موقعوں پر من گوئٹے کے بالکل مقابل کھڑا نظر آتا ہے ۔"

ٹامس من نے اپنا یہ ناول جس میں فاؤسٹس کی تھیم از سر نو نبھائی تھی جرمنی سے دوسری عالمی جنگ کے دوران جلاوطنی کے ایام میں کیلیفورنیا میں بیٹھ کر لکھا تھا گوئٹے کے یہاں جہاں ایک طرح کا سنبھلا ہوا انشاد پایا جاتا ہے، من کے یہاں فلسفیانہ بے نیازی پائی جاتی ہے گویا گوئٹے سے لے کر ٹامس من تک تاریخ کا متعین کردہ ایک تہذیبی سفر پورا ہوتا ہے ۔ ۱۹۴۸ میں اُنرلوکاچ نے اپنے ایک مضمون THE TRAGEDY OF MODERN ART میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بڑا اہم نتیجہ اخذ کیا ہے ۔ گوئٹے اور ٹامس من کا مقابلہ کرتے ہوئے لوکاچ اس مضمون میں لکھتا ہے :

"چنانچہ بورژوازی سماج کے ناگزیر حالات ہی جرمنی کے عظیم ترین مصنفوں کے تخلیقی رجحان کی سمت متعین کرتے ہیں ۔ گوئٹے کے فاؤسٹ کا اختتام جنت کے مناظر سے ہوتا ہے جو اس اعتبار سے حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ وہ انسان کے احیا اور اس کی آزادی کی اس یوٹوپیائی امید کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں جو سماجی اخلاقیات اور اقتصادی بنیادوں کی حامل ہے ۔ من کے فاؤسٹ کی فضا خاص طور پر اس لیے المیہ ہے کہ یہ بنیادیں غیر معین اور متزلزل رہی ہیں ۔"

گوئٹے نے جب اپنا ناول لکھا وہ جرمنی میں بورژوا طبقے کے اُبھرنے اور ارتقائی منازل طے کرنے کا دور تھا مگر جب من نے دوسری عالمی جنگ کے دوران اپنا ناول قلم بند کیا، دنیا نے جرمنی میں سرمایہ داری کا فاشسٹ روپ دیکھ لیا تھا جس نے نہ صرف جرمنی کو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا تھا ۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں ٹامس من جیسا حساس

فن کار جو جرمنی کی بورژوا تہذیب (بورژوا اس معنی میں جس کی وضاحت ہم اوپر تفصیل سے کر چکے ہیں) کی اعلیٰ قدروں کا وارث تھا، سرمایہ داری کی اس خوفناک شکل سے کسی طرح پُرامید نہیں ہو سکتا تھا۔ جس کی تمام بنیادیں ہل چکی تھیں۔

مَن خود شعوری سطح پر اس کی کچھ مختلف تعبیر کرتا ہے۔ مَن کا خیال تھا کہ جرمنی پر ہٹلر کی شیطانی قوت کا غلبہ ایک وقتی بات ہے۔ مگر مَن اس بات کا بھی اقرار کرتا ہے کہ جرمن ادب پچھلے کچھ سالوں سے سیاسی و سماجی بحران سے متاثر ہوا ہے۔ چاہے اس کی جو بھی تاویل کی جائے فاشسٹ قوت کا اتنا زبردست غلبہ جرمنی کے تخلیقی ادب کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور اس معنی میں لوکاچ کا تجزیہ بالکل صحیح تھا۔ دوسری عالمی جنگ کی تباہکاریوں نے نہ صرف جرمنی بلکہ پورے مغربی ادب کو متاثر کیا اور اس میں منفی رجحان جس نے مثبت انسانی قدروں پر عدم اعتماد کی شکل اختیار کی پیدا کیا۔ ٹامس مَن صحیح طور پر فاشزم کے غلبے کو وقتی مرحلہ سمجھتا تھا اور ایک حد تک اس کا مثبت انسانی قدروں پر اعتماد بھی برقرار تھا، مگر پھر بھی ایک حساس فنکار کے طور پر وہ فاشزم کی انسانیت سوز حرکتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے خیال سے جورج لشتھائم کی یہ رائے دُرست نہیں ہے کہ ٹامس مَن جرمن عوام کے متعلق وجدانی سمجھ رکھتا تھا جو لوکاچ کے سماجیاتی تجزئے کے مقابلے میں زیادہ صحیح تھی۔

فاشزم کی مخالفت کی حد تک کم از کم لوکاچ اور ٹامس مَن میں نظریاتی اشتراک تھا۔ مَن امریکہ جا کر لبرل ڈیموکریسی کا اس حد تک حامی ہوا کہ وہ جرمنی واپس لوٹنے کے خیال سے بھی ایک حد تک شاید گھبراتا تھا۔ وہ لوکاچ کے جرمن BURGER طبقے کے متعلق شاندار سے بھی اتفاق کرنے میں کوئی حرج تصور نہیں کرتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو وہ اس کے متعلق لوکاچ سے ملی جلی زبان ہی استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوکاچ اور مَن میں گہرے نظریاتی اختلافات تھے جنھیں کوئی بھی لوکاچ کا طالب علم آسانی سے نظرانداز نہیں کر سکتا۔ لوکاچ مارکسی نظریئے کا حامی تھا اور مَن ایک لبرل بورژوا ڈیموکریٹ تھا۔ مَن یہ سمجھتا تھا کہ فاوسٹس کے شیطان کے ساتھ معاہدے کی جڑیں قدیم جرمن روایت میں پوشیدہ تھیں لیکن لوکاچ اس کی وجہ جدید ترین سماج کے تجزئے میں تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح لوکاچ جرمن انبار نشین کے سلسلے میں اس دور کے کسانوں کی بغاوت کو بنیادی اہمیت دیتا ہے حالانکہ دوسرے مورخ اس کی ناکامی کی وجہ انبار نشین تحریک میں ہی تلاش کرتے ہیں۔ لوکاچ کے نزدیک عقلی اور

غیر عقلی رجحانات کے درمیان تضاد کی بڑی اہمیت ہے اور وہ ہیگل پر بحث کرتا ہو یا گوئٹے پر من کی بات کرتا ہو یا رومانی ادیبوں کی یا نطشے کی، لوکاچ عقلیت اور غیر عقلیت کے تضاد پر اکثر زور دیتا ہے "گوئٹے اور اس کا دور" میں لوکاچ کا سارا زور اس بات پر ہے کہ ۱۸ ویں صدی کی روشن خیال تحریک نے وائمر کلچر میں عروج حاصل کیا۔

لوکاچ ان نقادوں سے اتفاق نہیں کرتا جو گوئٹے کی عقلیت پرستی اور انسان دوستی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اسے عقل اور احساس میں میکانکی تفریق قرار دیتا ہے حالانکہ ان میں جدلیاتی رشتہ ہے۔ یہ لوگ لوکاچ کے خیال سے، ایسی ہی میکانکی تفریق پیدا کر کے یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ جرمن ادب پر غیر عقلی عنصر غالب ہے۔ لوکاچ اس سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: "جسے جرمن روشن خیال تحریک کا غیر عقلی عنصر سمجھا جاتا ہے وہ جدلیت کی جانب ایک قدم ہے: یا رسمی منطق، جو آج تک غالب رہی ہے، کے پرے جاتا ہے۔ رومانیت پرستوں کو لوکاچ مجموعی طور پر غیر عقلی عناصر قرار دیتے ہوئے ان کی غیر عقلیت کی سخت مذمت کرتا ہے۔ لوکاچ کے نزدیک فن کار کی فرنچ انقلاب سے وابستگی اس کے رجحان کی عکاسی کرتی ہے اور گوئٹے کو وہ ــ باوجود اس کے بعض موقعوں پر اس کمٹ منٹ سے پیچھے ہٹ جانے کے ــ اس انقلاب کا حامی سمجھتا ہے۔ لوکاچ یہ بات بھی جانتا ہے کہ من کا خیال اس سے کچھ مختلف تھا اور وہ جہاں شیلر کو فرانسیسی ہیومانزم کا نمائندہ سمجھتا تھا، گوئٹے کو جرمن ہیومانزم کا وہ اس بات کو محض افسانہ قرار دیتا ہے کہ گوئٹے بنیادی طور پر حیوی فلسفے کا، جو دراصل غیر عقلی فلسفہ ہے، نمائندہ تھا وہ اس بات کو بھی غلط قرار دیتا ہے کہ گوئٹے شوپنہاد اور نطشے کا روحانی باپ تھا۔ یا اس سے زیادہ یہ کہ وہ حقیقت نگاری کا مخالف تھا۔

لوکاچ اُن رجعت پرست نقادوں کا سخت مخالف ہے جو گوئٹے کو نطشے، شوپنہار وغیرہ کا پیش رو سمجھتے ہیں اور اس کی تخلیقات میں LEBENSPHILOSOPHIE کے عناصر تلاش کرتے ہیں چنانچہ وہ GOETHE AND HIS AGE میں لکھتا ہے:

"یہ افسانہ گوئٹے کے بعد کے ارتقا سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ عوامی زندگی سے اس کی علٰحدگی کو اپنا نقطۂ آغاز بنا کر، فرانسیسی انقلاب سے اس کی نفرت کے راستے سے ہوتے ہوئے، وہ اس گوئٹے تک پہونچتا ہے جو جدید غیر عقلی فلسفۂ حیات LEBENSPHILOSOPHIE کے اہم نمائندوں میں سے ایک ہے، جو شوپنہار اور نطشے کا روحانی والد ہے اور اس کے

علاوہ حقیقت نگاری کے برخلاف ایک خاص اسلوب کا ادبی مونس ہے ۔ یہ تاریخی انسان اتنا عام اور اثر انداز ہو چکا ہے کہ ہمیں یہ بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہونی چاہیئے کہ اس نے کس طرح فاشزم کے مخالف ترقی پسند مصنفوں کو بھی متاثر کیا ہے۔"

لشتعائم جیسے دانشوروں کو لوکاچ کے اس اپروچ پر یہ اعتراض ہے کہ اگر اس رجعت پرست افسانہ کی کوئی حقیقی یا مادی بنیاد نہیں ہے تو اس کی اس بے مثال کامیابی کی کیا وجہ ہے ؟ دراصل ایسے سوال اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب مارکسزم کی بڑی ہی میکانکی یا ادعائی DOGMATIC. صورت کو سامنے رکھا جائے ۔ بدقسمتی سے عام طور پر ایسا ہوا بھی ہے لیکن اگر مارکسزم کی صحیح اسپرٹ کو ذہن نشین کیا جائے تو اس قسم کے سوال پیدا نہیں ہوں گے لیکن چونکہ عام طور پر ہمارا واسطہ ایسے ہی میکانکی یا ادعائی قسم کے مارکسٹوں میں رہا ہے اس لیے ایسے سوالات پیدا ہونا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ۔ میکانکی اور ادعائی قسم کے مارکسٹوں نے ہمیشہ تہذیبی عوامل اور اس کی اپنی نفسیاتی خودمختاری سے انکار کیا ہے اور اوپری عمارت میں اکثر میکانکی قسم کا رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو مارکسزم کی اسپرٹ کے بالکل منافی ہے مارکس نے تو یونان کی مثال دیتے ہوئے فن اور سماجی ارتقاء میں ناہم آہنگی کا رشتہ بھی تسلیم کیا ہے ۔ اگر جرمن تہذیب اور اس کے اثرات کو مدِ نظر رکھا جائے تو اس قسم کے افسانے کی غیر معمولی مقبولیت جو گوئٹے کے شخصی رجحان کے متعلق مشہور ہوا ، کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ۔ جرمن قوم پچھلے سو سال میں جن ارتقائی منازل سے گذری اس کے پیشِ نظر یہ بالکل متوقع بات تھی ۔

لوکاچ نے جو اس کی وجہ بتائی ہے ، وہ سیاسی ہی سہی ، مگر مبنی بر حقیقت ضرور ہے ۔ آخر کوئی بھی سیاسی مظہر سماجی اور معاشی بنیاد کا ہی نتیجہ ہوتا ہے ۔ لوکاچ کہتا ہے کہ جرمن تہذیب میں غیر عقلی عنصر غالب اس لیے تھا کہ وہاں ۱۸۴۸ء کا بورژوا انقلاب اور ۱۹۱۸ء کا پرولتاری انقلاب کامیاب نہیں ہو سکے ۔ ۱۸۴۸ء میں بورژوا انقلاب کی ناکامی کی وجہ ، جس کا بہترین تجزیہ خود مارکس نے کیا ہے بورژوا طبقے کی ، فیوڈل طبقے کے مقابلے میں کمزوری اور اس کا تذبذب تھا اسی وجہ سے جرمنی میں بورژوا تہذیب (عقلیت جس کا جزو ہے) زیادہ پھل پھول نہیں سکی اور اس طرح جرمن تہذیب میں غیر عقلی اور حیوانی عنصر غالب رہا پھر اس معنی میں اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۱۸ء کا پرولتاری انقلاب بھی کامیاب نہ ہو سکا ۔ آخر سیاسی انقلاب ہی سماج میں ہمہ گیر تبدیلی پیدا کرتا ہے کیونکہ صحیح معنی میں سیاسی اقتدار آخر کار طبقاتی

اقتدار ہوتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں شکست نے جرمن قوم کی خودی کو مجروح کر دیا اور اس طرح پوری قوم
ایک ایسا فلسفہ قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئی جو طاقت کی پرستش پر مبنی تھا۔ اس ذہنیت نے فاشزم
کی کامیابی کے بیج بوئے۔ لوکاچ نے اس سلسلے میں اس اہم بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ
۱۸۴۸ء کے بورژوا انقلاب سے ناکامی کی وجہ سے وہاں کے سماجی منظر پر چھوٹے چھوٹے
تاجر چھائے رہے جو صاحب اقتدار کے سامنے بہت آسانی سے جھک جاتے ہیں اور فاشزم
کی کامیابی کی یہ بھی ایک اہم وجہ تھی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ گوئٹے کی غیر عقلیت اور ثنویت کو محض افسانہ قرار
دیتا اور اسے اس کے برخلاف جرمن عقلیت کا نمائندہ سمجھتا ہے۔ وہ شیلر کو بھی ۱۷۹۳ء میں
اس کی اس رائے کے باوجود کہ فرانسیسی انقلاب نے نہ صرف وہاں کے عوام کو بلکہ یورپ کے
ایک بڑے حصے کو واپس اندھیرے اور بربریت کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اسی عقل پرستی کا نمائندہ
قرار دیتا ہے۔ بعض نقادوں نے لوکاچ کی اس رائے کو غلط قرار دیتے ہوئے اس بات کی نشان
دہی کی ہے کہ شیلر کے سیاسی نظریئے میں دراصل اشرافی اور بورژوا قدروں کا امتزاج تھا۔ لوکاچ
بہر حال رومانیت کے مقابلے میں ہیگل اور گوئٹے کے ساتھ ہے۔ کانٹ کے برخلاف ہیگل یہ
مانتا تھا کہ کائنات کا علم ممکن ہے اور یہ کہ عقل علم مطلق حاصل کر سکتی ہے۔ فلسفے کی زبان
میں اسے معروضی تصوریت OBJECTIVE IDEALISM کہتے ہیں۔ کانٹ
اس کے برخلاف لاادریت AGNOSTICISM کا قائل تھا۔ شیلر حالانکہ اخلاقی
فلسفے میں کانٹ کے نظریات کا قائل تھا مگر پھر بھی جمالیات کے بعض نقاط کی حد تک ہیگل کا پیش
بین تھا۔ ہیگل کے نزدیک حسن کی تعریف "تخیل کا حسی مظہر" THE SENSUOUS APPEAR-
ANCE OF THE IDEA تھی۔ اور یہ تعریف گوئٹے کے تجربی رویئے کے مقابلے میں شیلر کے تصور
حسن سے زیادہ نسبت رکھتی تھی یہی وجہ ہے کہ لوکاچ شیلر کو اور اس کے فنی نظریات کو عزیز رکھتا
ہے۔ لوکاچ کے نزدیک ٹامس مِن بھی اس زمرے سے تعلق رکھتا ہے اور جیسا کہ اوپر بتایا
گیا، گوئٹے کا ہی تہذیبی وارث ہے۔

لوکاچ ادبی تنقید میں بھی اسی ہیگلی "جیثیت" کو اپنا معیار بناتا ہے۔ ٹامس مِن جس
کا لوکاچ بڑا مداح ہے، کے ناول MAGIC MOUNTAIN کی سب سے بڑی خوبی
اس کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں "حسی اور لمسی وحدت" پائی جاتی ہے۔ لوکاچ "میجک

ماؤنٹنس. کو ٹامس مَن کا بہت ہی اہم ناول سمجھتا ہے اور SOLZHENITSYS کے ناولوں
کی قدروقیمت طے کرتے وقت اسی ناول کو بنیاد بناتا ہے. چنانچہ اپنے مضمون
SOLZHENITSYN'S NOVEL میں لوکاچ لکھتا ہے:

"SOLZHENITSYN کے ناولوں کی جدید طرز کی رسمی خصوصیات میں
جو اصول کارفرما ہے اس کی درجہ بندی کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے ٹامس مَن کے ناول
"میجک ماؤنٹین" کا ذکر کرنا پڑے گا. یہ دیکھنے کے لیے کہ اس ناول میں نیا کیا ہے ہمیں صرف
یہ بات یاد کرنی ہوگی کہ حقیقت پسند عظیم ناول اپنے ابتدائی دور میں اس معروضی مجموعی نظام کا احاطہ
کرتا ہے جو پرانے نظام اخلاق میں پایا جاتا ہے تاکہ وہ سماجی حقیقت کی تصویر کشی مکمل طور پر کر سکے
اور اس کے ساتھ ہی وہ اس کی حسی اور صریحی وحدت کو بھی ملحوظ رکھے. ایسے موضوعات کے سلسلے میں
بھی جو انتہائی اختصار کے متقاضی ہیں ـــ اور یہاں ڈیفو کے رابن سن کروسو کا خیال ذہن میں آتا
ہے ـــ معروضات کی اجتماعی حیثیت کا یہ تصور واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے"

لوکاچ کے نزدیک میجک ماؤنٹین کی ندرت اس بات میں ہے کہ وہ اس ناول کے کرداروں
کو اپنے نارمل روزمرہ کے حالات سے نکال کر ایک نئے اور مصنوعی ماحول میں لے جاتا ہے
(اس ناول میں وہ مقام ٹی. بی کا سینی ٹوریم ہے جو ایک پہاڑ پر واقع ہے). اس کا نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ ناول کے کردار ایک دوسرے سے نارمل حالات میں نہیں ملتے جیسے کہ وہ روزمرہ
کی زندگی میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں. اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب ان کے درمیان
پیدائش، پیشے وغیرہ جیسی رکاوٹیں حائل نہیں ہوتیں اور ان کے درمیان اس نئے وجود
کی وجہ سے بنیادی طور پر مختلف ذہنی انسانی اور اخلاقی رشتے پیدا ہوتے ہیں. اس نئے ماحول
میں ہیرو کا اب تک پوشیدہ نظریاتی ٹکراؤ المیہ طربیہ شکل میں پھٹ پڑتا ہے. ٹامس مَن کا فوری
مقصد اپنے کرداروں کے ردعمل کو اس نئے ماحول میں کائناتی وسعت اور گہرائی عطا کرتا ہے
یہ نیا ماحول ان کرداروں کے فعل و عمل میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے لوکاچ کے نزدیک مقام کی
یہ تبدیلی جو دراصل سماجی پس منظر کی تبدیلی ہے بڑی اہمیت رکھتی ہے سینی ٹوریم جہاں ناول
کے کئی کرداروں کو بحالت مجبوری ایک ساتھ رہنا پڑ رہا ہے اور یہیں زندگی میں وہ پہلی بار
ایک دوسرے سے متعارف ہوئے ہیں. ایک ایسا مقام ہے جہاں انہیں زندگی کے ایسے
مسائل سے سابقہ پڑتا ہے جن سے وہ پہلے شعوری طور پر واقف نہیں تھے. اس طرح ٹی. بی

کا یہ سینسی ٹوریم ان نظریاتی ٹکراؤوں کو فوری طور پر حرکت میں لے آتا ہے جو اب تک پوشیدہ تھے لیکن اب اپنے تمام تضادات کے ساتھ شعوری سطح پر ابھر آتے ہیں۔

اسی مضمون میں (یعنی کہ سولزینتسن کے ناولوں والا مضمون) لوکاچ آگے چل کر ٹامس من کے اس ناول کا مقابلہ روسی ناول نگار MAKARENKO کے ایک بہت ہی اہم ناول THE ROAD TO LIFE سے کرتا ہے۔ یہ ناول روس میں انقلاب کے بعد تعلیمی ادارے کے ایک اہم تجربے سے تعلق رکھتا ہے۔ میکارنکو ایک ٹیچر کی حیثیت سے بڑی وضاحت کے ساتھ اس تعلیمی ورکشاپ کو اپنے ناول کا مرکزی خیال بنا کر پیش کرتا ہے۔ فن کار اس ناول میں بڑی چابکدستی سے ان مسائل کو پیش کرتا ہے جو اس ٹیچر کو آوارہ اور بدقماش قسم کے نوجوانوں کو، جن میں سے اکثر و بیشتر جرم کی دنیا سے بھی تعلق رکھتے ہیں، نئے سرے سے تعلیم دے کر کارآمد اور سوشلسٹ انسان بنانے میں درپیش ہوئے ہیں۔ نظریاتی ردِ عمل، اس تطہیری بحرانی افعال کی شکل ہیں، اس عمل میں، جس کے ذریعے کردار خود اپنا انکشاف کرنا چاہتا ہے، مرکزی رول ادا کرتا ہے۔ اس ہیئت کی انفرادیت -UNIQUE -NESS- اس کا سوشلسٹ مواد سے گہرا تعلق ہے۔ لوکاچ مقام اور حالات کی تبدیلی کو جس میں کبھی کبھی ڈرامائی عنصر بھی شامل ہو سکتا ہے۔ زندگی کے بعض حقائق پیش کرنے کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ لوکاچ اپنے ایک مضمون THE INTELLECTUAL (PHYSIOYNOMY میں کہتا ہے:

"لیکن حقیقت کا کوئی پہلو جب ادبی مقاصد کے عین مطابق نہیں ہوتا تو اس میں ترمیم لازمی ہو جاتی ہے۔ شکسپیر نے بہت سے سوانحوں اور اٹلی کے مختصر ناولوں کے ساتھ ایسا ہی کیا ہے اور بالزاک اور اسٹینڈہال نے بھی حقیقی زندگی کے واقعات کو حقیقی زندگی کے واقعات کو اپنے مقصد کے مطابق رد و بدل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان ادیبوں نے حقیقت کے بنیادی روپ کو ایسی ردّ و بدل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ حقیقت کی روح کو اپنی تحریر میں سمو سکیں۔"

ٹامس مَن کا میجک ماؤنٹن ہو یا میکارنکو کا "دی روڈ ٹو لائف" یا SINELAIR LEWIS کا MARTIN ARROWSMITH حقیقت کو ایک خاص فنی مقصد کے لیے اسی طرح تبدیل کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے "حقیقت کا صحیح نچوڑ" پیش کیا جا سکے۔ محض نارمل حالات میں کرداروں کو پیش کر دینے سے معروضی حقیقت اپنے تمام تضادات

کے ساتھ نہیں اُبھرتی اسی لیے سوشلسٹ ریلزم کو محض حقیقت کی فوٹو گرافی تصور کرنا زبردست غلطی ہے۔ اگر حقیقت کو فنکار، جیسا کہ لوکاچ کے اقتباس سے ظاہر ہے، اپنے طور پر MODIFY کرتا ہے تاکہ اس کی اس نئی شکل میں حقیقت، اپنے تمام تضادات کے ساتھ ہمہ گیر طریقے سے اس فن پارے کے ذریعے ہمارے سامنے آسکے۔ لوکاچ THE MAGIC MOUNTAIN میں اگر اپنے ناول کا SUNARIO وینس تک محدود رکھتا تو حقیقت کی ان تمام سطحوں کو اپنی تمام باریکیوں اور تضادات کے ساتھ پیش نہ کرسکتا جو اس نے ناول کا LOCALE وینس سے پہاڑ پر واقع ایک سینی ٹوریم میں تبدیل کرکے کیا ہے۔

محولہ بالا ناولوں میں جو مشترک عناصر پائے جاتے ہیں اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان فنکاروں نے ایک دوسرے کے ناولوں کو پڑھ کر کوئی تاثر قبول کیا ہے یا کوئی ادبی سرقے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لوکاچ کا خیال ہے کہ فن کی ابتدا کسی وجدانی UNITARY اصول کے تحت نہیں ہوئی لیکن آہستہ آہستہ ایک قسم کا تال میل پیدا ہوتا گیا اور اسی لیے ہمیں مختلف فن پاروں میں مشترکہ عناصر نظر آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ نظام کی یکسانیت بھی اس قسم کا اشتراک مختلف فن پاروں میں پیدا کرتی ہے۔ مثلاً سرمایہ داری نظام کے تحت تخلیق شدہ ادب میں ایک حد تک مشترکہ عناصر پائیں جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ناولوں میں ہمیں مشترکہ عناصر کا احساس ہوتا ہے کیونکہ یہ ناول وقت کے فرق کے ساتھ سرمایہ داری کے دور میں ہی لکھے گئے ہیں اور عمومی سطح پر یہ اسی نظام کے پیدہ کردہ انسانی مسائل کو مدِّنظر رکھ کر تخلیق کئے گئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ اگر مسائل نظامِ معیشت کی وجہ سے مشترک ہیں تو ان ناولوں میں کوئی انفرادیت نہیں ہو سکتی۔ ہر رائٹر کی اپنی تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے اور اس کا اپنا نظریہ حیات بھی اور فنکار ان مسائل کو اپنے اسی نظریئے کی روشنی میں دیکھتا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیت کے اعتبار سے پیش کرتا ہے۔ اور اسی سے اس کی تخلیق کی انفرادیت پیدا ہوتی ہے اور فنکار کا اپنا مقام پیدا ہوتا ہے۔

لوکاچ جیسا کہ ہم اوپر کی سطروں میں بتا چکے ہیں، ٹامس مَن کو بورژوا ہیومانزم کا نمائندہ سمجھتا ہے اور اس کی تخلیقات میں بورژوا انسانی قدروں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اپنے ایک مضمون THE IDEAL OF THE HARMONIOUS MAN میں جو لوکاچ کے مجموعۂ

مضامین WRITER AND CRITIC میں شامل ہے، لوکاچ کہتا ہے:

"پامال انسانی قدروں اور محروم انسانیت کے دفاع میں اناتول فرانس زولا کے مقابلے میں، اولین دور کا سنکلیر لیوس یوٹوپیائی سنکلیر کے مقابلے میں اور ٹامس متن دوز یا زوز کے مقابلے میں زیادہ ریڈیکل اور فیصلہ کن ہے۔"

لوکاچ اس سلسلے میں آگے چل کر ان مصنفوں کے متعلق ایک بہت ہی اہم بات کہتا ہے:

"یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ ہمارے دور کے نمائندہ حقیقت پسندوں کو مقبولیت حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے انقلاب میں گہرائی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اس تباہ کاری سے نفرت کرتے ہیں جو انہیں اپنے گرد و پیش نظر آتی ہے اور کسی ہیئت پرست کی طرح اپنی تحریروں کو محض نعروں سے آراستہ کرنے کا کام نہیں کرتے۔ ترقی پسند ادیبوں کو اس سلسلے میں پوری توجہ سے ان رویوں کا جائزہ لینا چاہیئے جو بائن رخ اور ٹامس من جیسے ادیبوں نے اپنائے ہیں۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ٹامس متن اور اس قسم کے دوسرے ادیبوں کی مقبولیت عام کی وجہ یہ ہے کہ ان کی موجودہ نظام سے بغاوت بڑی گہری اور دیرپا ہے اور کیونکہ وہ واقعی اپنے آس پاس کی تباہی سے یقیناً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے اور یہ لوگ اپنے فن کے لبادے میں محض رسمی ادب کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس بغاوت نے وہ اہم ادب پیدا کیا جو اس دور میں تقریباً ناممکن تھا۔ کیونکہ یہ دور فن دشمن دور کہے جانے کا ایک حد تک مستحق ہے۔ یہ دور دراصل بورژوا فن کے زوال کا دور ہے۔ حقیقت نگاری کے سچے نمائندے کس قدر زوال پرستی کے دو کٹر انسانیت دوست ادیب ہیں اس کا اندازہ ہمیں ان کے اس شعور سے ہوتا ہے جو وہ انسانی قدروں کی عظیم روائتوں سے متعلق رکھتے ہیں۔ روماں زولا اور ٹامس متن کا ان عظیم روائتوں سے تعلق شعوری ہے اور بڑا اہم بھی۔ لوکاچ اس کے بعد زور دے کر یہ بات کہتا ہے: "جو بات فیصلہ کن ہے وہ ہے بنیادی انسان دوست نظریئے سے معروضی رشتہ اور اس کا تسلسل — وہ تسلسل جو آج کے خاص حالات سے مناسب پیدا کئے ہوئے ہے۔ اور سرمایہ دارانہ کلچر کی نفی کرتا ہے کیونکہ یہ کلچر ہے جس کی ہر ایماندار فنکار کو نفی کرنا چاہیئے۔" لوکاچ یہاں مارکسی نظریۂ فن کی صحیح نمائندگی کر رہا ہے اور اسے ٹامس متن کی عظمت بھی اسی بات میں نظر آتی ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ کلچر کی ایک معنی میں نفی کرتا ہے کیونکہ اس کلچر کی فضا ادب اور فن کے لحاظ سے قطعاً ساز گار نہیں۔

چھٹا باب

لوکاچ، جیسا ماقبل کے صفحات سے ظاہر ہے، فلسفیانہ جمالیاتی وغیرہ مسائل کے ساتھ ساتھ عمرانی مسائل اور کلچرل مسائل پر بھی گہری نظر رکھتا تھا۔ بعض مرتبہ گفتگو کے دوران وہ اس قسم کے بڑے پیچیدہ مسائل کو آسان لفظوں میں بیان کر دینے کی بھی قدرت رکھتا تھا۔ اپنے بعض دانشور ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کے دوران اس نے مارکسی نظریئے سے کئی سماجی، تاریخی اور کلچرل مسائل پر اکثر سادہ لفظوں میں بڑی ہمہ گیر باتیں کہی ہیں۔ ہم اس باب میں ان مباحث کو سامنے رکھ کر گفتگو کریں گے جو ایسے مسائل پر اس نے اپنے دانشور ساتھیوں سے کی ہیں اور جو CONVERSATIONS WITH LUCKACS کے عنوان سے THEO PINKUS نے ایڈٹ کر کے ایک کتابی صورت میں شائع کی ہیں۔

لوکاچ تحریر ہو یا تقریر یا گفتگو، ابہام سے اپنا دامن حتیٰ الامکان بچاتا ہے۔ یہ بات محض اتفاقی نہیں ہے کہ نو ثبوتیت کے حامی فلسفیوں میں جن پر وہ سخت حملے کرتا ہے، صرف WITTGENSTEIN وٹگنسٹائن کو ہی ایک اہم فلسفی کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ وٹگنسٹائن WITTGENSTEIN جو اس بات کا قائل تھا کہ "فلسفے میں صحیح طریقہ صرف مندرجہ ذیل ہوگا: اس بات کے علاوہ جو کہی جا سکتی ہے کچھ نہ کہنا یعنی کہ نیچرل سائنس کے مفروضات کے متعلق ہی گفتگو کرنا۔ یعنی کہ وہ باتیں جن کا فلسفے سے تعلق ہے، اُن کے متعلق کچھ نہ کہنا....." اس طرح مابعد الطبعیات کو مسائل سے خارج کر دینا لوکاچ کی اسپرٹ کے مطابق ہے۔ اور یہ جسے لوکاچ علم الوجود (ONTOLOGY) کہتا ہے، کا خاصہ ہے (اور لوکاچ اپنی بات چیت کے دوران علم الوجود کی طرف بار بار لوٹتا ہے) وہ ان مسائل کو غیر مابعد الطبعیاتی طریقے

سے پیش کرنا چاہتا ہے۔" ان دانشور دوستوں کا جو کچھ بھی تجربہ رہا ہو ہمیں لوکاچ سے متعلق جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، یہ بات نہیں نظر انداز کرنا چاہیے کہ وہ ایک عرصے تک ہیگلی فلسفہ کا حامی رہا ہے اور اس پر اس کی گہری نظر تھی۔ اسی لیے اس نے اینگلس کے ثبوتی (POSITIVIST) سے اختلاف کیا اور اپنی تحریروں میں مارکسزم کی ثبوتی تعبیر کی مخالفت کی۔ لوکاچ کی گفتگو کتنی بھی سہل کیوں نہ ہو، وہ جدلیاتی مباحث سے ہرگز روگردانی نہیں کر سکتی۔

HANS HEINZ HOLZ نے لوکاچ سے دریافت کیا کہ پچھلے کچھ دنوں سے ہم مختلف زاویوں سے آپ کے فلسفیانہ نظریات سے بحث کر رہے ہیں اور ہم سماجی وجود کے علم الوجود (ONTOLOGY) (ONTOLOGY) سے لے کر تاریخی عمل کے (آج کے سیاسی منظر میں) عملی سائنس تک مختلف سوالات پر بحث کرتے رہے ہیں ..... آج میرے سامنے سب سے اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ تاریخ کے مارکسی نظریے کے تحت جو معروضی ضروریات سے تعلق رکھتا ہے، داخلی آزادی کے مسئلہ کو کس طرح سمجھنا چاہیے ظاہر ہے کہ یہ مارکسی نظر سے بڑا اہم اور بنیادی سوال ہے۔ اس پر مارکسی حلقوں میں ایک عرصے سے بحث ہوتی رہی ہے اور کئی مارکسی دانشوروں نے جس میں پلیخانوف اور لینن بھی اوروں کے علاوہ شامل ہیں، اس پر روشنی ڈال چکے ہیں اور دیگر مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی ابھی تک نزاعی حدود سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔ لوکاچ اس کے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ فیصلہ کن یا قطعی حد تک تو نہیں مگر اہم بات ضرور ہے۔ لوکاچ اس بات کا قائل ہے کہ اس مسئلے یعنی داخلی آزادی) میں بھی مارکسزم کی صحیح پوزیشن علم الحقیقت (ONTOLOGY) کی روشنی میں ہی طے کی جا سکتی ہے۔ اس سے بحث کرتے ہوئے لوکاچ کہتا ہے بنیادی مشکل اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ ایک طرف مارکسزم تاریخی عمل کی بنیادی خصوصیات بیان کرتا ہے جو ایک معنی میں انسانی ارادے سے آزاد ہیں (یعنی انسان جو چاہتا ہے وہ تاریخی اعتبار سے ناممکن ہو سکتا ہے) اور دوسری طرف مارکسزم اس پر بھی زور دیتا ہے کہ کچھ معاملوں میں لوگ، طبقے یا چند حالات میں افراد جو فیصلہ کرتے ہیں وہ تاریخ میں ایک خاص رول ادا کرتا ہے۔ اس سے ایک طرف تو ارادیت VOLUNTARISM کا موقف پیدا ہوتا ہے۔ اس میں نزاعی ارادیت سے لے کر اسٹالنی عہد کی افسر شاہی ارادیت شامل ہو سکتی ہے۔ اور دوسری طرف

میکانکی قسم کے جبر کا جو دوسرے انٹرنیشنل میں عام تھا، موقف پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔
اس عہد کے بعض نظریاتی ماہرین میں۔ مثال کے طور پر پلیخانوف کے یہاں۔ ہمیں ایک طرح کی ثنویت ملتی ہے، معاشیات میں جبر کا تصور اور نظریات کے قلمرو میں ایک طرح کی اختیاریت لیکن، لوکاچ کہتا ہے، میرے خیال سے معشیت میں بھی دہری حرکت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ معشیت بھی آخر کار مختلف افراد کا ایک غایت کے تحت اپنایا ہوا پراجیکٹ ہوتا ہے۔ علم الحقیقت کے نقطۂ نظر سے ہر معشیتی عمل متبادل فیصلوں پر مبنی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پیداواری طریقے کے لیئے ٹکنالوجی اپنانے کا فیصلہ یا ایک شخص یہ چیز خریدے یا وہ وغیرہ۔ حقیقت میں اس قسم کے متبادل فیصلوں کی پوری معشیت میں گنجائش ہے۔
اس کی اور وضاحت کرتے ہوئے پھر لوکاچ کہتا ہے کہ مارکس کے مطالعے سے یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ معشیت میں تین بڑے اہم حرکی DYNAMIC عوامل ہیں جو انسانی ارتقاء کے دوران مسلسل ارتقاء پذیر رہے ہیں؛ اس ارتقاء چاہنے والوں کا منشا جو کچھ بھی رہا ہو، ان کی ارتقاء کا یہ عمل اس سے بے نیازانہ جاری رہتا ہے۔ یہ پہلی نظر میں بڑے سادے اور ابتدائی نظر آتے ہیں۔

پہلا عامل FACTOR یہ ہے کہ محنت کی مقدار جو انسان کو جسمانی طور پر پیدا کرنے اور زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے مستقل گھٹتی رہتی ہے۔ انسان کے بالکل ابتدائی دور میں انسان کی ساری زندگی اسے اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے صرف کر دینا پڑتی تھی اس کے برعکس آج مہذب انسان اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی کل محنت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی خرچ کرتا ہے (لوکاچ یہ بات یورپی سماج کو اپنے سامنے رکھ کر کہہ رہا ہے ورنہ تیسری دنیا کے پچھڑے ہوئے ملکوں میں آج بھی آبادی کا ایک بڑا حصہ اپنی ساری محنت اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر ہی صرف کرنے پر مجبور ہے)۔ تاریخ کے مطالعے میں ہم کئی اہم موڑ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگی قیدیوں کو قتل کر دینے کی بجائے غلام بنا دینے کا رواج اس وقت شروع ہوا جبکہ غلام اس سے زیادہ پیدا کرنے لگا جتنا اسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ اس کے بغیر یا اس سے پہلے غلام بنانا بالکل بے۔معنی ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ اس دور میں غلامی کا رواج نہیں پیدا ہو سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حجری دور سے لے کر آج تک اس قسم کے ارتقاء کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ ہمیں یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ یہ عمل سیدھی لائن میں جاری رہتا ہے یا کسی اور شکل میں یہ تاریخی تعین کا مسئلہ ہے

دوسرا عمل یہ ہے کہ پہلے محنت پر فطری تقاضوں کا زبردست اثر تھا۔ پرانے حجری دور میں پتھر جس شکل میں بھی پائے جاتے تھے محنت کا ذریعہ تھے۔ اس وقت سے آج تک اس میدان میں بھی ارتقاء کا سلسلہ جاری رہا۔ محنت کی تقسیم بھی اسی کا نتیجہ تھی اور اسی ارتقاء کے نتیجے میں محنت نے سماجی روپ اختیار کیا۔ اس ارتقاء کے عمل میں طبعی پہلوؤں پر سماجی پہلو حاوی ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس میں تبدیلی بھی پیدا کرتے ہیں (طبعی پہلو ہیں) مارکس نے ایک بار کہا تھا کہ بھوک بھوک ہے مگر وہ بھوک جو عمدہ پکے ہوئے گوشت اور چھری کانٹوں سے مٹائی جاتی ہے اس بھوک سے مختلف ہوتی ہے جو کچے گوشت کو چیر کر کھا کر مٹائی جاتی ہے۔ طبعی ضرورتوں یعنی کھانا اور جنسی خواہش پورا کر کے ہی اس بات کو سمجھا جا سکتا ہے کہ کس طرح انسانی وظائف FUNCTIONS زیادہ سے زیادہ سماجی روپ اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ مارکس اسے فطری حدود کا سمٹنا "کہتا ہے۔ " لفظ سمٹنا" یہاں ضروری ہے کیونکہ یہ فطری حدود کبھی ختم نہیں ہو سکتیں کیونکہ انسان طبعی حاجتوں کے جبر سے آزاد ہو کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن کوئی شخص بھی اگر مثال کے طور پر پیدل سفر سے لے کر ہوائی جہاز کے سفر تک کو اپنے سامنے رکھے تو اس ارتقاء سے نہیں انکار کر سکتا۔ یہاں بھی ہمارے سامنے انسانی ارتقا کا وہ عمل ہے جو اس کے اختیار سے باہر ہے۔ تاریخ میں کئی ایسے دور گذرے ہیں جب کئی لوگوں نے خاص طور پر برسر اقتدار طبقوں نے ارتقا کے عمل کو روکنا چاہا جیسے کہ ایتھنس کے آخری دور میں یا عہد وسطےٰ کے بعض ادوار میں یا فرانسیسی انقلاب کے بعد رجعت کے دور میں۔ ارتقا کو روکنے کی اس کوشش کے باوجود یہ عمل جاری رہا اور انسانی سماج پر سماجی پہلو زیادہ حاوی ہو گیا۔

تیسرا عامل جو دوسرے دو عوامل سے قریبی تعلق رکھتا ہے وہ ہے مختلف سوسائٹوں کا ایک دوسرے سے زیادہ قریب آنا۔ ابتدائی دور میں انسان چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی متبادل وجود ممکن بھی نہیں تھا۔ تب سے یونان، روم اور عہد وسطیٰ کے ادوار سے ہوتا ہوا ارتقائی عمل جاری ہے۔ جس نے عالمی منڈی پیدا کی جو انسانی اتحاد کی معاشی بنیاد ہے۔ کلاسیکی، قدیم دور میں دو عظیم تہذیبیں بحر اوسط کے اس طرف یونانی تہذیب اور دوسری طرف چین کی اہم تہذیب، ایک ہی زمانے میں پائی جاتی تھیں۔ مگر ایک کا دوسری سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن آج افریقہ کے دور دراز کونے میں ہونے

والا سانحہ بھی جرمن مزدور کو براہِ راست یا بالواسطہ متاثر کرتا ہے۔ یہ قریب آنے کا عمل معروضی ضرورت کے تحت جاری رہتا ہے اور یہاں یہ بات اچھی طرح دیکھی جا سکتی ہے کہ انسانی ردِ عمل کسی طرح بھی ان انسانوں کے شعوری برتاؤ کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ شعوری طور پر لوگوں نے اس ارتقا کی خواہش کی ہو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مثال کے طور پر۔ یونان کا بالکل ابتدائی اور اضافی اتحاد، انفرادی شہری ریاستوں کے اپسی تصادم میں ظاہر ہوا۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بعد کی یکجہتی کی کوششیں۔ مثلاً وہ جس نے جدید قومی ریاستوں کی شکل اختیار کی اور جس کے لیے سامنتی نظام اور سامنتی مخصوصیت کے خلاف تلخ جدوجہد کرنا پڑی۔ خود شعوری SELF AWARENESS کے مرحلے تک بہت بعد میں پہنچی۔ (گویا) اسے پہلے سے شعوری طور پر ایک خاص سمت میں ارتقائی منازل طے کرنے کی کوشش نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ معروضی حالات کے دباؤ کا نتیجہ تھا)۔ اگر ہم آج بھی عالمی اتحاد کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ یہ انقلابی اور انقلاب دشمن طاقتوں کا مجموعہ ہے، اس میں مثال کے طور پر

امریکہ کے حبشیوں کی سفید نسل کے خلاف اور سفید نسل کی کالی نسل کے خلاف بغاوت شامل ہے اور یہاں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے جنوب میں جہاں کم یک جہتی پائی جاتی ہے اور جہاں غلامی کا اول بالا تھا یہ تصادم کم تھا حالانکہ یہ تضادات اور تیز ہوتے جاتے ہیں مگر پھر بھی یک جہتی کا نہ رکنے والا عمل جاری ہی رہتا ہے۔ میں یہاں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں، لوکاچ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ انسان کے متحدہ عمل سے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جس کا انسانوں کو پورا شعور حاصل ہو، ایسا بھی نہیں ہوتا کہ انسان متحدہ انسانیت کی خواہش کرتے ہیں جسطرح مثال کے طور پر، یونانی رواقی چاہتے تھے اور اس کے نتیجے میں یہ اتحاد پیدا ہوتا ہو۔ بلکہ یک جہتی کا نہ رکنے والا عمل ہے جو جاری رہتا ہے اور، جیسا کہ قدرتی بات ہے، اس کی نظریاتی نمائندگی بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک طرح کے عمل کا سوال ہے جو جاری رہتا ہے اور اس کی تکمیل بڑے تیز تضادات کی شکل میں ہی ہوتی ہے، اور انسانی خواہش کے برخلاف یہ تضادات یک جہتی کے عمل کے دوران اور تیز تر ہوتے جاتے ہیں۔

آگے چل کر لوکاچ کہتا ہے کہ میرے خیال سے یہ تین بڑے سلسلے معروضی معاشیاتی رجحانات کی بنیادوں پر ثابت کیے جا سکتے ہیں اور یہ کہ انہیں لازمی تصور کرنا چاہیئے۔ جہاں تک یہ معاشیاتی عمل کا لازمی حصہ ہیں۔ ہم انہیں تاریخی ارتقا کے عمل کے دوران ثابت کر سکتے ہیں۔ انہیں منطقی یا کسی اور ایسے طریقے سے مستخرج کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا معاشیاتی

ارتقا کے اس ضروری عمل اور مظاہر کے قلمرو REALM OF APPEARANCE (یہاں مظاہر کا قلمرو ہیگلی معنی میں استعمال کی گئی ہے کیونکہ اس معنی میں مظہر کو بھی حقیقت تصور کیا جاتا ہے کانٹین معنی میں نہیں جس کے مطابق مظہر، شے بالذات کے برخلاف انسان کی پیدا کی ہوئی چیز سمجھی جاتی ہے) میں جدلی عمل کا رشتہ ہے۔ مظاہر کے اس قلمرو میں ہمیشہ مختلف صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اور باہمی مبادلے کا عمل جاری رہتا ہے اور اصل نے کی بات کرتے وقت ہم مظاہر کی مختلف شکلوں کو نظرانداز کردیتے ہیں جو بڑی حد تک بدلتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر انگلینڈ اور فرانس میں سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقاء نے کتنی مختلف شکلیں اختیار کیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کا ارتقا (ہم یہاں محض معاشیاتی عمل کی بات کررہے ہیں) ایک ہی طرح کا ارتقا ہے۔ اس کے باوجود یہاں یہ بات بتادینا ضروری ہے کہ ہم صرف معاشی دائرے میں رہ کر ہی بات کررہے ہیں۔ انگلش سرمایہ داری نے چھوٹے چھوٹے کسانوں کی چھوٹی ملکیتوں کو بالکل ختم کردیا جبکہ فرانسیسی انقلاب نے چھوٹے کسانوں کی چھوٹی ملکیتوں کو جنم دیا جو آج تک قائم ہے۔ میں مانتا ہوں کہ معاشی ارتقاء کے کلیئے نے دو اہم سرمایہ دارانہ ملکوں میں قطعاً مختلف صورتیں اختیار کیں اور یہ تو معاشی بنیادی سطح پر ہوا (یہاں لفظ معاشی پر زور دینا ضروری ہے) نظریاتی سطح پر جو اختلافات ہوں گے اس کا ذکر ہی کیا۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ انسانی ارادے اور تاریخی جبر کے عمل میں بڑا ہی پیچیدہ رشتہ ہے۔ نہ مکمل ارادیت VOLUNTARISM اور نہ ہی مکمل جبر کا میکانکی نظریہ حقیقت کی تہ تک پہونچ پاتا ہے۔ اگر غیر مارکسی مفکروں نے پہلے نظریئے کو میکانکی طور پر اپنایا تو اکثر مارکسی مفکروں نے تاریخی جبر کے نظریئے کو میکانکی طور پر سینے سے لگا بیٹھے۔ اور پلیخانوف جیسے مارکسی مفکر بھی ایسی غلطی کا شکار ہوئے۔ لوکاچ علم تکوین ONTOLOGICAL کے نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ خود ارادیت اور جبر میں بڑا پیچیدہ جدلیاتی رشتہ ہے۔ ایک طرف تاریخی ارتقائی عمل غیر منقطع تسلسل میں جاری رہتا ہے اور اس کے تین بنیادی عوامل ہیں جن کا اوپر تفصیلی ذکر کیا گیا (یہ عمل انسانی ارادے کے باوجود جاری رہتا ہے) دوسری طرف لوکاچ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ہر صورت میں یہ عمل ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی مقررہ شکل اختیار کرے اور نظریاتی سطح پر تو اختلافات کا ہونا لابدی امر ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ دونوں انتہا پسندانہ رویوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے صحیح مارکسی

موقف اختیار کرتا ہے اور تاریخی عمل سے مثالیں دے کر اپنے نظریے کا ثبوت بھی بہم پہونچاتا ہے جو منطقی سے زیادہ تاریخی ارتقار کے عمل سے تعلق رکھتا ہے۔

HOLZ ہولز مظاہر کے ان اختلافات کی وضاحت چاہتے ہوئے اس مرحلے پر لوکاچ سے یہ دریافت کرتا ہے کہ کیا یہ مختلف شکلیں بنیادی طور پر تاریخ کے ارتقائی لازمی عمل کا نتیجہ نہیں ہیں؟ لوکاچ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ دونوں اسی بنیادی لازمی عمل کا نتیجہ ہیں لیکن یہ اصل ارتقائی عمل تاریخ میں ٹھوس اور منفرد طریقے سے پیدا ہوتا ہے اور اسی لیے عملاً یہ کئی مختلف صورتیں اختیار کر سکتا ہے باوجود اس بات کے کہ یہ ایک ہی عہد اور ایک ہی ارتقائی مرحلے میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ONTOLOGICALLY ہمیں معشیت کے دائرے میں یکلے کے پابند ضروری حصے میں اور مظہر کے حلقے سے متعلق حصے میں فرق کرنا چاہئے۔ ہیگل نے بڑی ستھری بات کہی ہے کہ کسی شے کا اصل اس کے مظہر کی پوشیدہ شکل ہے۔ میں پوشیدہ شکل کی تعبیر علم ادارک کی روشنی میں کرنا پسند کروں گا تاکہ اس میں ارسطو کے غیر متحرک محرک کی طرح پوشیدہ یقیناً پوشیدہ ہو۔ اگر ہم اسی بات کو جدید علم تکوین کی اصطلاح میں کہنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ اس عمل میں یعنی کہ تاریخی ارتقائی عمل میں نہ رُکنے والا سیدھا ارتقائی عمل کا سلسلہ ہے جبکہ اس کے برخلاف اس مظہر کی ہئیتیں مختلف اور انواع و اقسام کی ہوتی ہیں۔

HOLZ یہاں ایک اور بات کی وضاحت چاہتے ہوئے لوکاچ سے یہ کہتا ہے کہ اچانک یا غیر متوقع واقع ہونے والی باتیں CONTINGENCY بھی مظہر کی مختلف ہئیتوں کے زمرے میں ہی شمار ہوں گی۔ لوکاچ اس بات سے اتفاق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس ارتقائی عمل میں نیچر سے بھی پیچیدہ شکلوں میں تعامل ہوتا ہے جس میں معاشی اور سماجی عوامل بے شک حاوی رہتے ہیں کیونکہ نیچرل طاقت یا نیچرل عنصر معاشیاتی ارتقار کو فروغ دے گا یا روکے گا وہ بھی معشیت کی بنیاد پر ہی طے ہوگا۔ کوئلہ ملک کی معشیت کے لیے مرکزی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں اس کا انحصار کوئلے پر نہیں۔ معشیت کی پیداواری قوت پر ہے۔ کوئلے سے یہ بات طے نہیں ہوتی کہ کوئی ملک غریب ہے یا امیر بلکہ اس ملک کے سماجی اور معاشی ارتقا کے مرحلے سے یہ بات طے ہوگی کہ کوئلہ معشیت کے لیے اہم ہے یا نہیں۔ آج یہ بات ہم اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں جب کوئلے کا استعمال کم ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ پچھلے دو یا تین سو سال

سے قومی معشیت میں اس کی خاصی اہمیت تھی۔

ABENDROTH جو اس گفتگو میں شامل تھا، کچھ اختلاف کرتے ہوئے اور کچھ بحث کی توسیع کی خاطر کہتا ہے کہ انسانی سماج کے ابتدائی مراحل میں فطری حالات پیداواری عمل میں بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے فطری سرحد انسان کی پیداواری قوتوں کے سامنے سٹنے لگتی ہے، اتنی ہی معشیت فطری حالات کی پابندیوں سے آزاد ہوتی چلی جاتی ہے اب بھی کوئلے جیسا فطری منبع ایک خاص مظہری ہیئت کی ارتقاء میں، اگر ہم سارے انسانی معاشرے کے ارتقاء کو ہمارے سامنے رکھیں، اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ لوکاچ اس بات سے پوری طرح متفق ہوتا ہے۔ اس طرح اَبیندروتھ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اس عمل کے ابتدائی مراحل میں معشیت، بعد کے مراحل کے مقابلے میں فطری حالات کی زیادہ پابند ہوتی ہے اور اس لیے وہ ارتقائی عمل پر پوری طرح حاوی نہیں ہو سکتی۔

لوکاچ اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے یہ ممکن ہے مگر ہمیں یہ بات بھی مدِنظر رکھنا چاہیئے کہ معشیت کی ہی ضرورت نے کوئلے کو ان ابتدائی مراحل میں اہمیت دی اور کوئلے کی گھٹتی ہوئی اہمیت بھی معشیت کے ہی تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ کوئلے کی اہمیت میں کمی محض ٹکنالوجی کی ہی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اہم کارن تیل کا سستا ہونا ہے۔ (آج اگر تیل کے داموں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے تو پھر کوئلے کی اہمیت بڑھ سکتی ہے اس بات سے لوکاچ کی یہ رائے صحیح ثابت ہوتی نظر آتی ہے کہ یہاں ٹکنالوجی سے زیادہ معاشی تقاضوں کی اہمیت ہے)۔ ٹکنالوجی کے اعتبار سے آج بھی کارخانوں کو کوئلے کی مدد سے چلایا جا سکتا ہے۔ مگر تیل کی سستے داموں پر فراہمی اسے منڈی سے خارج کرتا جا رہا ہے۔ اسے فطری ذرائع کی آپسی جنگ بھی کہنا غلط ہوگا۔ یہ ذرائع تو دراصل اجناس پر مبنی معشیت کے ہاتھوں میں شطرنج کے مہرے ہیں۔ نہلے کو ستا نکال باہر کرتا ہے۔

اَبیندروتھ: بے شک، مگر ہمیں یہاں ایک اور بات مدِنظر رکھنی ہوگی۔ پیداواری عمل جتنا انسانی سماج کی ضرورتوں کے تحت آتا ہے، فطری عناصر اتنے ہی پس منظر میں چلے جاتے ہیں گویا یہ اس عمل کی ایک شرط ہے۔

لوکاچ: میں مانتا ہوں کہ اگر ہم اس پورے سلسلے کا تجزیہ کریں مثال کے طور پر برونز کے دور سے فولادی دور تک انسانی معاشرت کا سفر تو ہم دیکھیں گے کہ معشیت آج تک

یوں ہی اس عمل پر حاوی رہی ہے۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے البتہ یہ کہا جا سکتا، اور یہاں
میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں، کہ معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ معشیت کا کنٹرول بڑھ جاتا
ہے۔ یہی بات ہم سماجی نظریات کے دائرے میں بھی دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی فطری حدیں پیچھے
ہٹتی چلی جاتی ہے اور پھر یہ بڑی عجیب شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ فلسفی اس بات
کے قائل ہو گئے ہیں کہ مکان کی حدود سمٹ گئی ہیں اور زمان تیز رفتار ہو گیا ہے۔ یہ محض نظریاتی
تعبیر ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اب میں اس بات کی طرف لوٹنا چاہوں گا کہ کس طرح یہ کبھی
نہ رکنے والا ارتقائی سلسلہ مظاہر کے دائرے میں متباین ہئیتیں اختیار کرتا ہے اور سماجی روپ
اختیار کرنے کے نتیجے میں کس طرح معشیت کی بنیاد پر بالائی عمارت بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ بات
سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ کس طرح جب تک انسانوں کا گروہ وہی چیزیں صرف کرتا
تھا جو وہ پیدا کرتا تھا، تو آئیڈیالوجی، چند روائتوں سے جس میں پرانے لوگوں کی یادیں وغیرہ
شامل تھیں، اپنا کام چلا سکتی تھی۔ لیکن جب اجناس کی تجارت شروع ہوتی ہے۔ اور
پیداوار میں تھوڑے سے اضافے کے ساتھ ایسا ہونا ضروری ہے یہ سلسلہ پہلے کمیونٹی کے خارجی
حدود پر شروع ہوتا ہے اور پھر ساری کمیونٹی پر چھا جاتا ہے، ہم اجناس کی تجارت قانونی نظام
کی ضرورت پیدا کرتی ہے۔ میرے خیال سے یہ اس بات کی ایک مثال ہے کہ کس طرح مظاہر
کے قلمرو کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی جو ان تین اصولوں کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، بالائی عمارت
کو بھی متاثر کرتی ہے اور اس طرح ہیگلی معنیٰ میں اس پوشیدہ جوہر کے فوق جو صحیح معنی
میں جوہر کی واضح حرکت ہے، ایک بہت ہی پیچیدہ، کثیر الجہات، اور متفرق مظاہر کا حلقہ
بن جاتا ہے جس میں انفرادی مختلف غایت رکھنے والے پراجیکٹ بہت بڑا رول ادا کرتے
ہیں۔ حالانکہ ہو سکتا ہے یہ فیصلہ کن نہ ہو۔ معاشیت کے اعتبار سے، اس طرح پیداواری
قوتوں کے ارتقاء کی وجہ سے غلامی نظام کا ٹوٹنا بہت ضروری ہو گیا تھا اور اس کی جگہ جاگیر
دارانہ نیم غلامی Feudal SYSTEM کا نظام لے رہا تھا۔ لیکن مختلف ملکوں میں اس نے
جو شکلیں اختیار کیں وہ وہاں کے لوگوں کے ٹھوس حالات پر منحصر تھا۔ یہاں ہم ان
تفصیلوں میں نہیں جا سکتے۔ اب ہم اس مرحلے پر پہنچے ہیں۔ جہاں ہم مارکس کے ساتھ یہ کہہ
سکتے ہیں کہ لوگ اپنی تاریخ خود بناتے ہیں لیکن اپنے منتخب کردہ حالات میں نہیں۔ یہ حالات
یہ اصل بنیاد جس پر انسان اختیار نہیں رکھتا۔ اس میں وہ معاشی پابندیاں، معشیت کا جوہر

لازمی عمل شامل ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اس طرح ہم سماجی ارتقا کے پورے میدان کا ایک مقررہ نقطے سے احاطہ کر سکتے ہیں، وہ ارتقا جس کو روکا نہیں جا سکتا مختلف لوگ الگ الگ شکلیں دریافت کر سکتے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی پالیسی پر عمل ہوتا ہے پھر بھی ایک طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے اتحاد کا عمل بھی جاری ہے جو ایک دن تمام بنی نوع انسان کو متحد کر سکتا ہے جو بات یقینی نہیں ہے، اور اب میں اسی فیصلہ کن سوال کی طرف آرہا ہوں، وہ یہ ہے کہ یہ یکجہتی کیا شکل اختیار کرے گی۔ جو بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی اور جس طرف اب ہم آرہے ہیں اور جو ہمارے خیال سے مارکسزم پر روشنی ڈالنے کے لیے بہت اہم ہے۔ اب ہم سوشلزم کو کس معنی میں لیتے ہیں اس پر منحصر ہے۔ ایک نقطہ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ سوشلزم ایک لازمی اور حتمی نتیجہ ہے معیشت کے لازمی ارتقا سے کچھ ایسے بنیادی رجحانات پیدا ہوئے ہیں۔ جس سے سوشلزم معیشت کے ارتقا کا حتمی نتیجہ ہے۔ اپنے کمیونسٹ مینیفسٹو میں بھی مارکس نے یہ کہا ہے کہ طبقاتی جدوجہد کی صورت میں سوشلزم ایک متبادل معیشتی نظام کی صورت میں ابھر آ سکتا ہے۔ مارکس نے اسے حتمی قرار نہیں دیا۔ اس لیے میرے خیال سے معاشی ارتقا سماج واد کی کامرانی کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتا ہے۔ یہ کمیونسٹ منی فسٹو میں محض جزوی بات نہیں ہے۔ گوتھا پروگرام کی تنقید میں بھی کہا ہے کہ کمیونزم کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ محنت میں لزوم کا عنصر نہیں رہنا چاہیے اور اسے زندگی کی اول ضرورت بن جانا چاہیے۔ (یعنی محنت زندگی کا لازمی جز نہیں ہو گی۔ مگر انسان ایک طرح سے جبلی طور پر اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے گا۔ اسی بات کو مارکس نے دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ محنت اور تفریح میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا)۔ مارکس نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ سوشلزم کا ایک مقصد محنت کو انسان کے قابل بنانا ہے لیکن محنت از خود انسان کے قابل نہیں بن جاتی ہے۔ انسان کو اسے اپنے قابل بنانا پڑتا ہے۔

آبیندر رتھ : دوسری طرف مارکس بڑی ہوشمندی سے کہتا ہے اور بالکل صحیح کہتا ہے کہ سماجی اعتبار سے ضروری محنت کے وقت میں کمی محنت کو انسان کے قابل بنانے کی اولین شرط ہے۔

لوکاچ : ہاں یہ بات صحیح ہے، مگر محنت کے اوقات میں کمی یہ اسی ارتقائی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔

آبیندروتھ : لیکن اس میں یہ بھی تو ———— ہوسکتا ہے جناب لوکاچ اور مارکس کے یہاں ہمیں یہ بات بھی ملتی ہے کہ وہ رجحانات بھی پورے سلسلے کے ضروری ارتقا کے خلاف ہیں، کامیاب ہوسکتے ہیں۔ خاص طور سے اس صورت میں جب طبقاتی جنگ کا غلط متبادل نتیجہ ہو۔ یعنی کہ مظلوم اور ترقی پسند طبقے کی شکست کی صورت میں اور اس طرح سماجی اعتبار سے ضروری محنت کے اوقات میں کمی کے عمل میں رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے، بلکہ یہ عمل اُلٹی سمت میں جا سکتا ہے۔

لوکاچ :- میں اس بات سے انکار نہیں کرتا، بالکل نہیں۔ میرے خیال سے نہ رُکنے والا یہ سلسلہ (معشیتی ارتقا کا) بڑے پیمانے پر ہی سمجھا جا سکتا ہے اور میں پھر سے یہ کہوں گا کہ سوسائٹی جتنی زیادہ سماجی SOCIAL ہوگی اس سمت میں دباؤ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ آپ مجھے معاف کریں مگر مارکسی ٹریڈیشن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں جب بھی حقیقی دنیا کی بات کرتا ہوں، بالزاک BALZAC کی طرف ضرور اشارہ کرتا ہوں۔ اعادہ RESTORATION کے دور کے عظیم مورخ کی حیثیت سے بالزاک نے ٹھیک یہ بتایا کہ کس طرح اشرافیہ سرمایہ دار بن گئے اور کس طرح اشرافیہ کی اس وقت زرعی سرمایہ دار نمائندگی کر رہے تھے۔ جنھوں نے اس ایجادات کے دور کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ بالزاک کے یہاں ہمیں ایسے قدیم آفاقی ذہنیت رکھنے والے زمینداروں کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں جو قطعاً نہیں بدلے اور اپنی جاگیردارانہ قدروں پر قائم رہے۔ بالزاک کے یہاں ایسے کیریکٹرس بالکل DON QUIXOTES کی طرح لگتے ہیں۔ اس دور کی مضحکہ خیز ہستیاں۔ میں نے یہاں یہ بات اس لیے کہی ہے کہ آپ کو ان مخالفانہ رجحان (جو تاریخ کے دھارے کے خلاف جاتا ہے) کی مثال دوں جس کی ہم بات کر رہے ہیں۔ ان (جاگیرداروں) کا منشا تھا ۱۷۸۹ء سے فرانس کی طرف مراجعت لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس رجحان کے پُرخلوص حامی ہمیں ڈون کوکزوٹس کی طرح مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔ تن تنہا جن کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ اس معنی میں میں بالزاک کو بڑا مورخ سمجھتا ہوں۔ اس تضاد کو سمجھنے کے لیے اسے مارکس سے واقفیت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ ہماری ذاتی خواہشوں اور اُمنگوں کے برخلاف کسی طرح معاشی ارتقا کا سلسلہ

بغیر روک ٹوک کے جاری رہتا ہے ۔ اس حالات کی بالزاک نے بڑی خوب صورت تصویر کشی کی ہے ۔ ایسی کئی مثالیں ہمیں تاریخ میں مل جاتی ہیں ۔ حالانکہ ہمیں رجعت کے دور کے چند دہوں کی رعایت ملحوظ رکھنی ہوگی ۔ چند ادھر ادھر کے تاریخی حوالوں سے آپ بالکل غلط نتائج بھی اخذ کر سکتے ہیں ۔ میں یہ مانتا ہوں کہ انسانی تاریخ کی یہ خصوصیت ہے کہ ٹھوس عمل کے میدان میں ارتقائی کلیے جو بڑے بڑے قوانین ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، ان میں متبادل باتیں ALTERNATIVES ممکن ہیں ۔ یعنی یہ کوئی ضروری نہیں کہ کسی ارتقائی عمل کا ایک ہی نتیجہ بدیہی ہوگا ۔ اس کا متبادل نتیجہ بھی ہو سکتا ہے ۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آزادئ مطلق کے کوئی معنی ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مطلق آزادی محض پروفیسروں کے دماغ کی ایجاد ہے مطلق آزادی کا کبھی کوئی وجود نہیں رہا ہے ۔ آزادی کے زیادہ صحیح معنی یہ ہیں کہ زندگی انسان کو ٹھوس متبادل ALTERNATIVES پیش کرتی ہے (ان متبادل راہوں میں سے اسے کسی ایک راہ کو چننا ہوتا ہے) میں یہاں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ اس پیچیدہ ارتقائی تسلسل میں آدمی، چند حالات میں ایسا متبادل راستہ اختیار کر سکتا ہے جو حالات کے تعامل میں داخلی طور سے دور کا رشتہ رکھتا ہو ۔ اس وقت میرے ذہن میں رواقیوں اور ابیقوریوں کا دلچسپ موقف ہے جو انہوں نے قدیم زمانے کے آخری دور میں اختیار کئے تھے ۔ اس دور کی حقیقی زندگی کے پیشِ نظر یہ متبادل راستے حقائق پر مبنی نہیں تھے ۔ لیکن پھر بھی انسانی ارتقاء کے عمل میں بہر حال متبادل طریقے تھے ۔ اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کیوں اس کے بعد طویل عرصے تک، فرانسیسی انقلاب اور اس کے بعد تک، رواقیوں کے خیالات زندہ طاقت تھے ۔

اس کے بعد HOLZ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ اگر حقیقی زندگی میں ALTER-NATIVES ممکن ہیں اور اگر شعوری طور پر ایک معروضی متبادل راستہ اختیار کیا جاتا ہے ۔ اور ٹھوس تاریخی حالات کے پیشِ نظر اس فیصلہ کے ذریعہ ایک غایت کو مدنظر رکھ کر پراجیکٹ بنایا جاتا ہے تو اس پراجیکٹ کا عمومی حالات پر ردِّ عمل ہوگا ۔ اس ردِّ عمل کے نتیجہ میں کچھ نئے حالات پیدا ہوں گے اور اس طرح ان معروضی حالات کی پیچیدگی میں اضافہ ہوتا جائے گا مقدار میں بڑھتی ہوئی معروضی حالات کی پیچیدگی وصفی تبدیلی پیدا کرے گی کیونکہ کمیت میں تبدیلی آخر کار کیفیت میں تبدیلی کا باعث ہوتی ہے ۔ لوکاچ نے اس بات کا جواب دیتے ہوئے

کہا کہ میں یہاں اینگلس کے خط کا حوالہ دینا چاہوں گا جس میں اس نے لکھا ہے کہ ارتقا کا عمل یقیناً ایک سماجی عمل ہے۔ مگر ذاتی یا انفرادی عمل کو کوئی اہمیت نہ دینا غلط بات ہوگی۔ بہت ہی معمولی مثال کے ذریعہ اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ ایک میٹنگ ہوتی ہے اور مقرر تقریر کرتا ہے۔ میٹنگ میں شامل لوگ مقرر کی تجاویز سے اختلاف کرتے ہیں اور انہیں ٹھکرا دیتے ہیں۔ لیکن میٹنگ پُرامن رہتی ہے، کوئی چیختا چلاتا نہیں نہ ہی کوئی سیٹیاں بجاتا ہے لوگ خاموشی سے بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر بھی مقرر اچھی طرح سمجھ جاتا ہے کہ اس کی باتیں قابل قبول نہیں ہیں۔ میں ایک ایسے تجربے کی بات کر رہا ہوں جو ہم میں سے ہر ایک کو ہوا ہے۔ کنسرٹ کا فنکار یا ڈرامے کا ایکٹر روزانہ ایسی باتیں محسوس کرتا رہتا ہے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیتا ہے کہ اس کے فن کی قدر شناسی ہوئی ہے یا نہیں ...... میں آپ سے یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ انفرادی فیصلے کی اہمیت صفر نہیں ہوتی۔ اگر یہ عملی طور پر ظاہر نہ ہو سکے پھر بھی سماجی ارتقار کا نہایت ہی پیچیدہ عمل ان انفرادی فیصلوں، جو یوں تو بہت طاقتور نہیں ہوتے، لیکن یہ بالکل غیر اہم بھی نہیں ہوتے، - پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ یہ انفرادی فیصلے جب متحد ہو کر ایک عظیم تاریخی عمل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو یہ سماجی اعتبار سے بڑے ہی نتائج خیز ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرانسیسی انقلاب کی ابتدا میں پیرس کے لوگ بغاوت کے جذبات رکھتے تھے اور پھر ایک دن سب نے مل کر بیٹیل جیل پر حملہ کر دیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انفرادی فیصلوں نے متحد ہو کر ایک زبردست سماجی اہمیت کے واقعے کو جنم دیا۔

ہولز: ایک دن لوگوں نے فیصلہ کیا ..... یہ تو خطرناک حد تک وجودیت جیسی بات لگتی ہے۔

لوکاچ: ہاں۔ ایک معاملے میں وجودیت واقعی صحیح ہے۔ میں نے اپنے پہلے والے وجودیت کے خلاف پمفلٹ میں کہا ہے کہ ہم مارکسیوں نے اینگلس کے خبردار کرنے کے باوجود انفرادی فیصلوں کی اہمیت کو مجرمانہ حد تک نظر انداز کیا ہے۔ پتہ نہیں آپ کو یہ یاد ہے یا نہیں میں نے اپنے پمفلٹ میں لکھا ہے کہ جب ایک فیکٹری کے مزدور ہڑتال کرتے ہیں تو اس میں چالیس ہزار فیصلے شریک ہوتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ چالیس ہزار لوگوں نے ایک فیصلہ کیا۔ فیصلے چالیس ہزار لوگ کرتے ہیں اور پھر سب مل کر یہ فیکٹری کا ایک فیصلہ ہو جاتا ہے اینگلس

نے بالکل درست بات کہی ہے کہ انفرادی فیصلوں کو آپ غیر اہم قرار نہیں دے سکتے۔ ویسے یہ مقدار کے اعتبار سے اتنا چھوٹا ہو سکتا ہے کہ اس کی عملی اہمیت زیادہ نہ ہو۔ مگر علم الوجود کے اعتبار سے ایسا کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ہولز: لیکن ٹھیک یہی انفرادی فیصلوں کے متعلق سارتر کا موقف ہے جس نے اس کے مارکسی نقادوں کو بھونچکا کر دیا وہ فرانس کا گارودی ہو یا سوویت یونین کے نقاد یا .....

لوکاچ: دیکھئے ان باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگوں میں چیزوں کو میکانکی پابندیوں سے ناپ تول کرنے کا عام طور پر رجحان پایا جاتا ہے جبکہ دراصل ضرورت (ہر صورت حال میں) مختلف درجوں میں موجود رہتی ہے۔ ہم میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ۱۹۱۷ میں اگر لینن اتنی قوت اور ہٹ دھرمی کے ساتھ، نومبر کی مسلح بغاوت کے لیے جہد و جہد نہ کرتا تو، نومبر کی یہ مسلح بغاوت ہو بھی پاتی یا نہیں .....

آبینڈروتھ: ..... کم از کم کامیابی کے ساتھ ہوتی یا نہیں

لوکاچ: ...... اور یہ کہ دو ماہ کے بعد اس مسلح بغاوت کا وہی اثر ہوتا۔ یہاں بھی سوال یہی ہے کہ روس کو اپنی پیداواری قوتوں کو ۱۹۱۴ء کی سطح سے آگے لے جانا تھا۔ یہ ایک معاشیاتی حقیقت ہے۔ لیکن یہ کہ اس نے (یعنی کہ پیداواری قوتوں کو آگے لے جانے نے) سوشلسٹ صورت اختیار کی۔ یہ متبادل حالات میں انسانی فیصلے کا نتیجہ تھا (روسی چاہتے تو ویسے سرمایہ دارانہ نظام بھی اختیار کر سکتے تھے) میرا مقصد یہاں لینن کے اس فیصلے کو پرستارانہ اہمیت دینے کا ہرگز نہیں ہے۔ ماسبق انقلابی تحریک کی غیر موجودگی میں، بالشیوک پارٹی کی سرکشانہ سرگرمیوں کے بغیر، عالمی جنگ نہ ہونے کی صورت میں، ایسی صورت حال ہرگز پیدا نہ ہوتی جس میں لینن کا فیصلہ اتنی زبردست اہمیت اختیار کر جاتا اس طرح میں پھر مارکس کی طرف واپس آتا ہوں کہ "انسان اپنی تاریخ خود بناتا ہے مگر اس کے اپنے انتخاب کیے ہوئے حالات میں نہیں۔ میں اس کو اب تھوڑے سے فرق کے ساتھ یوں پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آدمی (حالات کے مطابق) جوابی عمل کرنے والا ہے۔ MAN IS RESPONDING BEING اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی متبادل حالات کے پیش نظر جو معروضی ہوتے ہیں۔ RE-ACT کرتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کچھ رجحانات کی تجرید کر کے کرتا

ہے جو فی البدیہہ حالات سے پیدا ہونے والے عمل میں شامل ہوتے ہیں اور وہ انہیں سوالات کی صورت میں رکھتا ہے اور ان کے جواب تلاش کرتا ہے۔ اسی لیے اس کا ردِ عمل محض فی البدیہہ نہیں ہوتا۔ اگر ایک شیر ہرن کو چیر کر رکھ دیتا ہے تو یہ اس کا حیاتیاتی عمل ہوتا ہے اور اس میں اس کے لیے کسی متبادل فیصلے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ انسان اپنی محنت کے ذریعہ اپنے ماحول سے باہم معاملہ کرتا ہے اور اسے سوالیہ صورت دیتا ہے۔ جس کا وہ خود جواب تلاش کرتا ہے، اس کا متبادل عمل تاریخ کے عمل میں اپنی جڑیں پیوست کر لیتا ہے۔

آزادی اور ضرورت میں جو اختلاف ہے وہ ہمارے ماضی کے ورثے کا حصہ ہے لیکن اسے اس کے معروضی شکل میں اسی حد تک رکھنا چاہیئے جتنا یہ خیال کہ انسان کا غائی عمل علت و معلول کے رشتے سے آزاد ہو سکتا ہے اور یہ کہ ایک طرف غائی رشتہ ہے اور دوسری طرف علت و معلول کا۔ حقیقت یہ ہے کہ علت و معلول کے یہ رشتے اس وقت حرکت میں آتے ہیں جب ایک غایت کو مدِ نظر رکھ کر کوئی پہل کی جاتی ہے جبکہ علت و معلول کا یہ لزوم برقرار رہتا ہے۔ اب میں مانتا ہوں کہ اس کے نتیجے میں آزادی اور جبر کے درمیان (اسے عام طور پر جبر و اختیار کہا جاتا ہے جو رشتہ ہے وہ ایک نئی شکل میں ابھرتا ہے۔ جو ٹھوس شکل ہے جو آزادی کو نابود نہیں کرتی مگر اسے ٹھوس شکل عطا کر دیتی ہے۔ ہم اس بات سے پہلے ہی بحث کر چکے ہیں کہ اگر ہم آزادی کے مجرد تصور کی بات کریں تو کس طرح ہم بوریڈن کے گدھے کی طرح ایک ایسی حالت کا سامنا کریں گے جس میں متبادل فیصلے محض ایک دھوکا ہیں اور ان کا کوئی جواب ممکن نہیں۔ حقیقت میں ایسے متبادل حالات کوئی معنی نہیں رکھتے، اہمیت ہوتی ہے ٹھوس فیصلوں کی جو بہت ہی مختلف ٹھوس حالات میں کیے جاتے ہیں۔ اس سے مناسبت رکھنے والی یہ فطری بات ہے کہ نارمل زندگی سے عظیم تاریخی نقاط تک کئی ایسے درمیانی مراحل ہیں جس میں انسانی فیصلوں کی شاید ہی کچھ زیادہ اہمیت نظر آتی ہو مگر اہم تاریخی موڑ پر ایک شخصیت میں یہ جمع ہو کر اہم رول ادا کرتے ہیں۔ سماجی ارتقا حتمی معنی میں کیوں نا آہنگ عناصر پر مشتمل ہوتا ہے اس کی وجہ حسب ذیل ہے: کسی بھی فیصلے میں (جو متبادل فیصلوں میں سے ایک ہوتا ہے) کسی نہ کسی طرح کے نا آہنگی رکھنے والے عناصر در آتے ہیں اور اس نا آہنگی کی وجہ سے ان کی خاصیت حادثاتی (ACCIDENTAL CHARACTER) ہوتی ہے۔ میں یہاں اس بات کی طرف بھی توجہ دلانا چاہوں گا کہ خود مارکس نے یہ بات کہی ہے کہ کسی انقلابی لمحے میں کون سے لوگ اس کے (انقلاب کے) لیڈر ہوں گے

یہ بات قطعی حادثاتی ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ مارکس نے اس حادثاتی عنصر کو کم کرنے کی کوشش کو قبول نہ کیا ہوتا حالانکہ سماجی معنی میں یہ بات محض اتفاقی نہیں ہے کہ فرانسیسی انقلاب کو اتنے قابل دانشور نصیب ہوئے جو سماجی اعتبار سے پوری طرح یکجہتی نہیں رکھتے تھے۔ اس حد تک یہ بات ایک خاص معنی میں سماجی اعتبار سے معین DETERMINED ہوتی ہے......

تاریخ کے عمل میں یہ بات ہمیں نہیں بھولنی چاہیئے۔ اتفاق کا بھی عنصر ہوتا ہے جو سماجی ارتقا کی ناہم آہنگی کی وجہ سے ہوتا ہے اور معاشی بنیادیں مختلف النوع اور آپس میں متصادم عوامل کی وجہ سے بھی۔ جب یہ مسائل نظریاتی صورت اختیار کرتے ہیں تو ان اتفاقیہ عناصر اور ناہم آہنگیوں کا زور اور بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے آئیڈیالوجی کو معاشیاتی ارتقا کا سیدھا نتیجہ سمجھنا بڑی ہی غلط بات ہوگی کیونکہ اس میں کئی اتفاقیہ اور باہمی ناآہنگی رکھنے والے عناصر بھی موجود ہوتے ہیں۔

اس بات میں کس کو شبہہ ہوسکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ معشیت کو انھیں قوانین سے نہیں چلایا جاسکتا جن سے جاگیردارانہ نظام کو چلایا جاتا ہے۔ مگر کہیں رومن قوانین کا سہارا لیا گیا تو کہیں اور دوسرے قوانین کا۔ انگلینڈ میں رومن قوانین لاگو نہیں ہوئے۔ اس بات سے بھی پتہ لگتا ہے کہ ایسے معاملات میں بھی (یعنی نظریاتی معاملات میں) یکسانیت کا ہونا ضروری نہیں ہے کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ انگلینڈ میں سرمایہ دارانہ نظام نے رومن قانون نہیں اپنایا لہٰذا وہ صحیح معنیٰ میں سرمایہ دارانہ نظام نہیں ہے یا یہ کہ وہ اس لیے ٹھیک سے کام نہیں کرتا یہاں ارتقا کی ناہم آہنگی بالکل صاف نظر آتی ہے۔ ہمارے سامنے جاگیردارانہ مذہبیت سے لے کر نشاۃ کے دور سے ہوتے ہوئے جدید دور تک دو بہت اچھی ارتقا کی نظریاتی مثالیں ہیں۔ فلورنیس اور وینس کی مصوری دونوں اس ارتقا کا اظہار ہیں پھر بھی دونوں ارتقائی عمل پر بالکل مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک معنیٰ میں دونوں میں اشتراک ہے لیکن یہ اشتراک بھی ان کے اختلاف کا نتیجہ ہے.....

ہولز: لیکن تسکینی TUSCANY کے مناظر کا بھی بصارتی حس پر وینس کے مقابلے میں مختلف اثر ہوا ہوگا۔

لوکاچ: ہاں، میں مانتا ہوں کہ یہ بصریاتی اثر جو ہمیشہ سے موجود تھا۔ آرٹ کے لیے ایک خاص اہمیت اختیار کرتا ہے کچھ مخصوص حالات میں۔

ہولز: قدرتی بات ہے

لوکاچ: کیا ہالینڈ میں تیرہویں صدی میں تو وہ LIGHT کے حالات ایسے ہی نہیں تھے

جیسے کہ REMBKHNDT کے زمانے میں تھے ؟ لیکن ہالینڈ میں انقلاب کے بعد ہی
ان حالات کا ریمبران وغیرہ پر دہ اثر ہوا (جن کے ہم قدرداں ہیں) اس لیے یہاں بھی میں
یہ کہنا چاہوں گا کہ جتنا سماج ترقی کرتا ہے اتنا ہی ہمارے لیے نیچر کی پیچھے ہٹتی ہوئی حدوں کو
محسوس کرنا ممکن ہو جاتا ہے.. بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لوکاچ کچھ اور بھی بہت اہم باتیں
کہتا ہے جس کا خلاصہ اس اہم معاملے پر اور روشنی ڈالنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ بہت
اہم بحث ہے اور مارکس واد کی تاریخ میں اس سوال کی بنیادی اہمیت رہی ہے اسی لیے ہم
اس سوال پر کچھ اور روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس بات پر لوکاچ کے موقف کی اور وضاحت
ہو جائے۔ لوکاچ کہتا ہے کہ سماج ایک غیر معمولی پیچیدگیوں کی پیچیدگی ہے جس میں دو متضاد
اقطاب POLES ہیں۔ ایک طرف سماجی کلیت ہے جو بالآخر انفرادی پیچیدگیوں کو
باہم تعامل کے ذریعے معین کرتی ہیں اور دوسری طرف انفرادی شخصیت کی پیچیدہ ذات ہے
جو اس عمل (تاریخی عمل) کا حصہ ہیں۔ یہ پورا عمل ان دونوں اقطاب کے باہمی تعامل سے متعین
ہوتا ہے۔ اسی عمل کے ذریعہ انسان اپنے آپ تک پہونچتا ہے۔ اینگلس نے اس ارتقا کی
ابتدا کو محنت اور زبان کی شروعات کی شکل میں بڑی اچھی طرح بیان کیا ہے۔ یہاں فطری
سرحد کے پیچھے ہٹنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسانی زندگی زیادہ سے زیادہ انسانیت کے قریب آتی جاتی
ہے۔ لیکن ارتقا کی ناہم آہنگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی جتنی انسانیت کی منازل طے
کرتی ہے، انسانیت دشمن عناصر اتنے ہی گھناؤنی شکلیں اختیار کرتی جاتی ہیں۔ میں نے آج
تک یہ بات تسلیم نہیں کی کہ فاشزم نے جو کچھ کیا وہ محض انسانوں کے ابتدائی دور میں "پھینک
دیے جانے" کا نتیجہ تھا۔ فاشزم تو سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی یافتہ شکل کی بے رحمی اور
انسانیت دشمنی ہے۔ آئخ من جیسا انسانی درندہ تو اُس دور میں بھی پیدا ہونا مشکل تھا۔
جب انسان انسان کا گوشت کھاتا تھا میں نہیں سمجھتا کہ ایسا بھیانک انسان جس نے عوام کا قتل
عام اپنا افسر شاہی پیشہ بنا لیا تھا ایسے دور میں بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ یہ تو سامراجی دور کی ہی
پیداوار ہو سکتا تھا اور اس سے پہلے ایسے انسان کا وجود ممکن نہیں تھا۔ دور وسطیٰ میں
INQUIZITION نے بھی ایسا درندہ صفت انسان پیدا نہیں کیا۔ اس دور میں صرف
سیاستداں یا مذہبی جنون کے شکار انسان پائے جاتے تھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا
اس مخصوص مثال سے کیا مطلب ہے۔ آدمی سے انسان بننے کے عمل میں کئی تضادات

ہیں۔ انسانیت کے مدارج طے کرنے کا عمل جتنا تیز ہوگا اس کا ردِّ عمل بھی اسی طرح تیز تر ہو کر دوسری انتہا کو پہونچ جاتا ہے۔ ساری انسانیت جب تک یہ تمام مدارج طے نہیں کر لیتی یہ متضاد عمل جاری رہے گا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ عمل کبھی تمام نہیں ہوگا اور میرے خیال سے یہی وجہ ہے کہ مارکس معشیت کو — جو انسانیت کے عروج کا عمل ہے — ہمیشہ ضرورت یا حاجت کے قلمرو میں رکھنا چاہتا ہے ..... ایتھنس، فلورنیس، وینس، ہالینڈ کے ۱۷ ویں صدی کے حالات کی مثال ہم لیں، یہاں سوال یہ ہے کہ ارتقار کا عمل کب سماجی اہمیت کی بات کو جنم دیتا ہے۔ یہ کمیونزم کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن کمیونزم بھی سماجی ارتقار کے عمل سے ہی جنم لیتا ہے۔ یہ خارجی حالات انسانیت کو عروج پر پہونچائیں گے یا زیادہ سے زیادہ انسانیت دشمن قوتوں کو مضبوط کریں گے یہ خود انسان پر ہی منحصر ہے۔ معاشیاتی ارتقار خود بخود اسے جنم نہیں دے سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو چیلنج کرنے میں کہ معاشیاتی ارتقار خود بخود سوشلزم کو جنم دیتا ہے۔ میں کمیونسٹ مینی فسٹو میں بتائے گئے سوشلزم کے بدلوں کو صحیح طور پر سمجھ کر استعمال کر رہا ہوں۔

اس سلسلے میں لوکاچ آگے چل کر کچھ اور اہم باتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آزادی کا دائرہ وسیع ہو کر زیادہ سے زیادہ انسانوں کو اپنے حلقے میں لیتا رہتا ہے اور سماجی ارتقار کے ساتھ اس کی ہمہ گیریت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اعلیٰ نظریاتی تصورات کا جس میں علوم و فنون شامل تھے، کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا تعلق بھی اعلیٰ طبقوں کے چند لوگوں سے تھا، عام انسان اس سے محروم سمجھے جاتے تھے۔ زیادہ تر اخلاقی فلسفی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پیدائشی معنیٰ میں نہیں کہ رواقی یا اپیقیورس کے فلسفے پر عمل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن گوئٹے پہلا شخص ہے جس نے اخلاقیات کا دائرہ، تمام انسانوں تک وسیع کیا۔ گوئٹے کا خیال تھا کہ اخلاقیات کی تکمیل کا تعلق آدمی کی ذہنی قابلیت سے نہیں ہے۔ اسی لیے گوئٹے ایک عظیم اخلاقی اہمیت رکھنے والا انسان ہے گوئٹے کے کئی کردار مثلاً EGMONT میں KLARCHEN یا HERMANN & DOROTHEA میں DOROTHEA یا WILHELM MEISTER میں PHILINE وغیرہ۔ یہ کردار بناتے ہیں کہ معمولی اور سادہ انسانوں کے لیے سیدھے سادے حالات میں اخلاقی تکمیل حاصل کرنا ممکن ہے اوروں کا اس سے متعلق اخلاقی فیصلہ کچھ اور ہی کیوں نہ

ہو۔ میں اس لیے گوئٹے کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ اس نے اپنی تخلیقات میں اس قسم کی جمہوریت کا صاف نقشہ پیش کیا جس کی مستقبل میں بھی بڑی اہمیت ہے اس سے پہلے کسی ایک عظیم مفکر یا کسی اخلاقی نظام میں ایسا رجحان نہیں رہا۔ اس لیے میرے خیال سے ماضی کے اور مفکروں کی طرح گوئٹے کی زبردست اہمیت ہے۔ اسی لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ حالانکہ معیشت کا ارتقاء ان چیزوں کو ممکن بناتا ہے پھر بھی انسانی فیصلے کے ذریعے ہی جو وہ کئی متبادل فیصلوں میں سے انتخاب کرتا ہے، ان کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ انسان کو اور میکانکی مارکسٹ دانشوروں کی طرح تاریخ کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی نہیں سمجھتا۔ وہ مادی قوتوں، تاریخی حالات اور انسان کی فعالیت میں جو نازک جدلی رشتہ ہے اسے اس کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ سمجھتا ہے۔ تاریخی جبر HISTORICAL DETERMINATION کے تصور نے اکثر دانشوروں کو دھوکہ دیا ہے۔ لوکاچ دونوں انتہاؤں، یعنی فرد کو مکمل آزاد سمجھنا یا تاریخی حالات کے ہاتھ میں مجبور محض، سے بچتا ہے۔

انسانی ذہن، تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے، تصورات کے ذریعہ پیش بینی کرتا ہے جو بعد کے تاریخی ارتقاء کے ذریعہ عملاً بھی ممکن ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ تصورات جیسا کہ ہومر اور شکسپیر کی مثالوں سے ظاہر ہے، صدیوں کے لیے گم ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی عملی اہمیت انسانیت پر واضح ہوتی ہے۔ بہر حال اس قسم کے بالقوہ POTENTIAL رجحان انسانی ارتقاء کی خصوصیت ہے۔ اور تاریخی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہی بالقوہ رجحان حقیقت بننے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں۔ آبیندروتھ کا جو اس گفتگو میں لوکاچ کے ساتھ شریک تھا خیال ہے کہ بعض اوقات ایک خیال جو کسی خاص تاریخی دور کی پیداوار ہوتا ہے اور جس میں اس دور کے ماورا پیش بینی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے، ایک خاص اہمیت حاصل کر لیتا ہے اور بدلے ہوئے حالات میں بھی نئی تعبیروں کے ساتھ اس کا احترام باقی رہتا ہے۔ یہ اس طرح ممکن ہوتا ہے کہ نئے پیدہ شدہ مسائل اور اگلے دور کے معروضی سماجی مسائل میں جو متوازیت ہوتی ہے اسے ذہنی پیش بینی کے ذریعہ دوبارہ حرکت میں لایا جائے۔ اکثر نئے حل اس دھوکہ میں تلاش کیے جاتے ہیں کہ ذہنی پیش بینی کی قدیم ہیئت، ماقبل کا تخیلی عمل اب بھی قائم ہے۔ اس طرح پرانے خیالات راسخ العقیدگی کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں۔ رومن قانونی نظام بھی اسی طرح دوبارہ عمل میں آیا۔

لوکاچ کے خیال سے اگر آدمی صرف پیداوار سے تعلق رکھتا اور جوابی عمل سے نہیں تو اس تسلسل کے لیے کوئی عضو ہی نہ ہوتا۔ چونکہ زندگی کئی حقیقی مسائل پیدا کرتی رہتی ہے۔ ایک فرد اپنی ضرورت کے مطابق متبادل باتوں میں سے اپنے عمل کے ذریعہ اس نظریاتی تسلسل کے بہاؤمیں سے انتخاب کرلیتا ہے۔ اس مرحلے پر ہولز ایک اور اہم پہلو کی طرف ہماری توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے۔ لوکاچ نے تاریخ کے باہم آہنگ عمل کا ذکر کیا تھا۔ ہولز کا خیال ہے کہ یہ باہم آہنگی بالآخر زمانی باہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اس کو ہولز معروضی سماجی ناہم زمانیت DISSIMULTANAITY کا نام دیتا ہے۔ ہولز اس کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ آج ہمارے درمیان بہت ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک پائے جاتے ہیں۔ کئی ملکوں میں ہمیں قدیم پیداواری طریقے اور قدیم سماجی ادارے نظر آئیں گے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اسی مُلک میں صنعتی پیداوار بھی بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ (ہمارا آج کا ہندوستان اس کی بہترین مثال ہے)۔ ایسی باتیں یعنی کہ ایک ہی وقت میں سماجی ارتقار کے مختلف ادوار کا وجود جو بہرحال ایک دوسرے کے ساتھ تعلق بھی رکھتے ہیں، نہایت ہی پیچیدہ صورت حال پیدا کرتے ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے بھی اور حقیقی تاریخی اعتبار سے بھی اور اس طرح ناقابل اعتبار اور غیر متوقع حالات کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

لوکاچ یوں تو اس بات سے اتفاق کرتا ہے مگر اسے ہولز کے ایک لفظ "ناہم زمانیت" پر اعتراض ہے۔ زماں میں گذرنے اور جو موجود ہے اس میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بالکل ہی مختلف اور متضاد سماجی حالات، چاہے وہ ایک ہی ملک میں پائے جائیں یا پوری دنیا میں، دل چسپ ہیں کہ وہ ہم زمان ہیں۔ لوکاچ اس بات پر زور دیتا ہے کہ کچھ لوگ آئین اسٹائین کے نظریہ کو جو زمان سے متعلق ہے غلط سمجھ کر فیشن کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں۔ اسی کی اقتدا میں لوگ زمان کے موضوعی اور موضوعیتی اضافی تصورِ وقت کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ جبکہ زمان ایک عام علم الوجود سے متعلق CATEGORY ہے جو انسانی سماج کے ارتقار سے قطعاً بے نیاز ہے۔ مطلب یہ کہ وقت تو اپنے طور پر گذرتا ہی رہے گا۔ چاہے انسانی معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو یا محض ایک حالت پر ٹھہرا رہے۔ ہمارا عمل زمان سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہ تصور کہ ابتدائی دور کے مقابلے میں ہمارے دور میں وقت زیادہ تیزی سے گذرتا ہے، آئنسٹائن کے نظریئے کی مہمل صورت ہے۔ اس بات سے خود

آئنسٹائن تڑپ اٹھتا۔ غیر ترقی یافتہ تہذیب کا مسئلہ یہی تصادم ہے۔ جب تک کسی عالمی معشیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اور ایسا کوئی تصادم نہیں پایا جاتا تھا۔ دونوں کا پرامن باہمی وجود ممکن تھا اور ابتدائی سماج (قدیم سماج) کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب استعماری طاقتوں نے اس کے خود مختار وجود میں خلل اندازی کی۔ تصادم کا مسئلہ سرمایہ داری کے ارتقاء کے ساتھ پیدا ہوا۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کس طرح وہ سماج جو ابتدا میں سرمایہ دارانہ عالمی منڈی کا محض نشانہ تھے، اور جن پر ترقی یافتہ ممالک کا مکمل اقتدار قائم تھا، تصادم کے اس عمل سے اس تاریخی عمل کا موضوع بن گئے یعنی خود اس ہمہ گیر تبدیلی کے عمل سے متاثر ہوئے۔

اس بات کے اختتام سے پہلے ہم لوکاچ کی چند مختلف موضوعات پر جن پر مارکسی حلقوں میں اکثر بحث ہوتی رہتی ہے، گفتگو کا خلاصہ پیش کریں گے۔ مسائل جو خاصے پیچیدہ ہیں ان کی وضاحت کے لیے لوکاچ کے بعض مشاہدات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ بچھڑے ہوئے ممالک میں اشتراکی نظام نافذ کرنے یا کسی ملک کو جاگیر دارانہ نظام سے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف لے جانے میں جو مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ خاصے پیچیدہ ہیں اور یہ تبدیلی کا عمل بڑا کربناک ہے۔ لوکاچ اس سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مارکس نے CAPITAL کی جلد اوّل کے پیش لفظ میں اس بات پر زور دیا ہے کہ کچھ مراحل ایسے ہوتے ہیں جو لازمی ہیں لیکن سائنس کی مدد سے اس تبدیلی کے عمل کی طوالت کو کم کیا جاسکتا ہے اور اس طرح اس سے پیدا ہونے والے کرب کو محدود کرنا ممکن ہوسکتا ہے۔ لوکاچ مارکس کی اس بات کو بہت اہم سمجھتا ہے۔ مارکس اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب ہم اس پورے عمل کو سائنٹفک طریقے سے سمجھیں۔ مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقاء کی تفصیلی وضاحت کی اور اس کے ماضی اور ماضیٔ اقصیٰ کی کچھ باتوں کی نشاندہی کی۔ کسی ایک آدمی کے لیے یہی قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ مارکس ایشیائی پیداواری طریقے کا تفصیلی مطالعہ نہیں کرسکا۔ اس موضوع پر اس نے سرسری سی بحث کی ہے۔ حالانکہ اس میدان میں بھی اس نے بعض بڑے اہم انکشاف کیے ہیں۔ لیکن ہم آج ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے کہ افریقہ میں پیداواری رشتوں کی کیا ہیئت تھی۔ ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہمیں اس کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔ لیکن ہمارا رجحان یہ رہا ہے

کر اخباری مضامین کی بنیاد پر وقتی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اگر ہمیں سقراط کے مقرر کردہ معیار کو کہ ہم کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے۔ ایمانداری سے عمل میں لانا ہے تو اپنی لاعلمی کا بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اعتراف کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنی لاعلمی کو پیشِ منظر میں لانا ہی ہوگا۔ اس نقطۂ نظر سے بھی ہمیں اسٹالینی طریقۂ کار کی مذمت کرنا ہوگا۔

۱۹۲۵ء میں ٹریڈ یونین پر بحث کرتے ہوئے لینن نے چین کے بارے میں چند باتیں کہی ہیں اور پھر کہا کہ سچ مچ مجھے پتہ نہیں کہ جنوبی چین میں کیا ہو رہا ہے۔ لینن نے بڑی سخت گیری سے اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود کامنٹرن کی دوسری کانگرس نے یہ پروگرام مرتب کر لیا کہ چینی مزدوروں کی پارٹی کے چینی انقلاب میں کیا کیا فرائض ہوں گے۔ ان ممالک میں دراصل کیا ہو رہا تھا اس کا پتہ لگانا مارکسی سائنسداں کا فرض تھا لیکن اسٹالن کے دور میں مارکسی سائنس نے یہ فرض انجام نہیں دیا۔ اسی طرح اس زمانے میں مارکس کی مکمل تحریر بھی شائع نہیں کی گئیں جو ان کے لیے بہت ہی آسان تھا۔ کم از کم ہمارے سامنے مکمل مارکس تو آجاتا۔ مارکس اینگلس انسٹی ٹیوٹ کے پاس مارکس کے سارے مخطوطات ہیں۔ ریازانوف نے ۱۹۳۰ میں بتایا تھا کہ صرف کیپیٹل ...... کی ضخیم دس جلدیں ہوتی ہیں۔ یہ مکمل آج تک نہیں چھپ سکیں (اب یہ تمام تحریریں کئی جلدوں میں شائع ہو رہی ہیں)۔ GRUNDRISSE کی اشاعت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مارکسزم سے متعلق ابھی ہمیں کتنے انکشافات کرنا باقی ہیں۔ افسوس ہے کہ اسٹالن ازم اتنا آسان کام بھی نہ کر سکا۔

ان باتوں پر غور کرنے سے اب یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالانکہ سیاسی معنیٰ میں لینن نے محنت کشوں کی پارٹیوں کے لیے ان کے فرائض کا عام خاکہ تیار کر دیا تھا۔ اور استعماریت سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد ترقی کر رہی ہے، سوشلسٹ نظام کے لیے ضروری تھا بلکہ یہ اس کا ابتدائی فرض تھا کہ وہ ان تمام پچھڑے ہوئے لوگوں کی مارکسی تاریخ اور مارکسی تجزیہ تیار کرائے کیونکہ بغیر سائنٹفک تجزیئے کے ہماری جدوجہد ناتمام رہے گی۔ اگر آج کیپٹیل CAPITAL اور مارکس کا تجزیہ ہمارے سامنے نہ ہوتا تو محنت کشوں کی جدوجہد کی صحیح سمت کیسے مقرر ہوئی؟

یہاں دوسری پارٹیوں اور جماعتوں سے اتحاد کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ لینن نے ۱۹۰۵ سے ہی کسانوں کی پارٹی سوشل ریولیوشنری پارٹی سے اتحاد کرنا ضروری سمجھا

تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ اس نے اس پارٹی کی مسلسل کڑی تنقید بھی کی کیونکہ وہ اس جماعت کی آئیڈیالوجی کو غلط سمجھتا تھا۔ ہمیں اسٹالن کے دور کی غلط باتوں سے انکار کرنا ہوگا۔ جو مقبول عام محاذوں POPULAR FRONTS سے متعلق تھیں۔ یعنی کہ جو لوگ ہمارے اعلانات سے اتفاق نہیں کرتے وہ قطعاً رجعت پرست ہیں۔ متحدہ محاذ جوان مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی وقت ممکن ہے جب باشعور عناصر ایک ساتھ جدوجہد کریں اپنی اپنی بساط کے مطابق اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کی نکتہ چینی بھی کرتے رہیں۔ یہ دونوں باتیں (یعنی ایک ساتھ جدوجہد کرنا اور ایک دوسرے کی تنقید بھی) مستقبل کے لیے بڑی اہم ہیں۔ ورنہ یہ غیر اصولی اتحاد بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں حصہ نہ لینے والوں کی تحقیر کی جاتی ہے جو بذاتِ خود بہت بڑی بات ہے بلکہ یہ کہ اس میں شرکت کرنے والوں کی تنقید نہیں کی جاتی۔ اس قسم کے اتحاد ضروری ہوتے ہیں (یعنی اصولی اتحاد جس میں ایک ساتھ جدوجہد پر بھی زور ہو اور ایک دوسرے کی اصولی تنقید پر بھی) کیونکہ اگر ایسا دور ہو جس میں ان رشتوں کو سمجھنا ایک عملی ضرورت ہوتی ہے، ہماری اپنی ہی صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک میں بھی سماجی ساخت کی تبدیلیوں کے لیے جدوجہد اس اتحاد کو ضروری بنا دیتی ہے۔ یہ اتنا ہی پیچیدہ سوال ہے جتنا بچھڑے ہوئے لوگوں سے رشتے کا سوال۔ ایسے معاملات میں ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اس بات میں تمیز کرے کہ 'یہ میں جانتا ہوں'، اور 'یہ میں نہیں جانتا'۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی طرف ABENDROTH اشارہ کرتا ہے کہ 'میں یہ نہیں جانتا'، کوئی آخری اور قطعی بات نہیں ہے بلکہ تغیر پذیر بات ہے۔ اس کا تعلق ارتقائی عمل کے ٹھوس تجربے سے ہوتا ہے مقبول محاذ کے مختلف شرکاء کے لیے 'یہ میں جانتا ہوں'، اور اس کے نتیجے میں 'آج میں یہ چاہتا ہوں' قسم کی باتیں بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ مقبول عام اتحاد کو ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ 'میں یہ نہیں جانتا' قسم کے سوال بھی ارتقاء کی اگلی منازل پر پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے مستقل اختلاف اور تنازعہ اور باہمی تنقید ضروری ہے۔ تاکہ باہمی مذمت سے دامن بچا کر مقبول محاذ میں ضروری حلقہ بندیاں ہوتی رہیں۔

لوکاچ ان باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہاں 'میں نہیں جانتا' والی بات کی طرف دھیان دینا ضروری ہے۔ اس کا تعلق کسی بھی فیصلے کے عام علم الوجود سے متعلق

کیریکٹر ہے۔ انسانی تاریخ میں شاید آج تک کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا گیا جس کے متعلق موضوعی اور معروضی تمام عوامل کا مکمل علم پہلے سے رہا ہو۔ اور اس معاملے میں اور آج کے پیچیدہ دور میں ایسے عناصر کا فی بعد حصہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جن کے متعلق پہلے سے ذہنی طور پر مکمل علم حاصل نہ ہو۔ پہلے سے شاید نامعلوم عناصر کا حصہ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ علم الوجود کے اعتبار سے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر عملی اقدام سے پہلے یہی حالت ہوتی ہے۔ بعد میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تاریخ میں بالکل غلط نظریے کی بنیاد پر لوگوں نے صحیح عملی اقدام کیے ہیں۔ اس کی اہم مثال یہ ہے کہ اسکندریہ سے ایتھنس کا سفر بطلیموس کے نظریات پر مبنی علم الافلاک پر طے ہوتا تھا۔ اور پھر بھی لوگ ٹھیک اپنی منزل پر پہونچ جاتے تھے۔ حالانکہ اس کی نظریاتی بنیاد غلط تھی۔ ہمیں انسانی عمل کی اس بات کو ہمیشہ مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ علم کتنا ہی کیوں نہ ہو، انسان کو عملی قدم تو بہر حال اٹھانا ہی ہوتا ہے۔ اگر کہرے کی حالت میں میں جنگل میں بھٹک رہا ہوں تو بھی گھر واپس پہونچنا ہی ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے کوشش اس حالت میں بھی لازمی ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ جہاں میں بھٹک گیا ہوں پہلے زمین کے اس حصہ کا نقشہ تیار ہو جائے اور تب تک ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا چاہیے۔ ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ تب تک میں یقیناً بھوک کی شدت سے ہی مر جاؤں گا۔ چاہے ٹھوکر کھا کر ہی کیوں نہ صحیح راستہ ملے۔ میری کوشش راستہ تلاش کرنے کی ہوگی۔ صحیح نقشے کا انتظار کرنے سے تو بہتر یہی ہے کہ ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کیا جائے۔ حالانکہ یہ بھونڈی مثال ہے مگر بات سمجھانے کے لیے مفید ہے۔

ساتواں باب

لوکاچ نے ادب اور جمالیات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ دراصل لوکاچ کو شروع ہی سے ادب اور جمالیات سے گہری دل چسپی تھی۔ ان موضوعات پر اس کی کئی کتابیں بھی ہیں

،GOETHE AND HIS AGE ،THEORY OF THE NOVEL ،THE HISTORICAL NOVEL

،THE MEANING OF CONTEMPORARY REALISM ،ESSAYS ON THOMAS MANN

SOLZHENILSYN ،WRITER AND CRITIC ،STUDIES IN EUROPEAN REALISM وغیرہ

اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ لوکاچ نے بہت کچھ اس موضوع پر لکھا ہے جو یا تو ابھی تک چھپ نہیں سکا ہے یا جرمن سے انگریزی میں ترجمہ ہونا باقی ہے۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ لوکاچ کی جرمن تحریر جو ابھی تک انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوئی ہیں زیادہ بھاری ہیں۔ بہت کچھ جو انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے وہ اسٹالن کے دور میں دباؤ کے تحت لکھا گیا تھا ایک نقاد نے تو اس کے فرانسیسی ادب پر بالزاک وغیرہ سے متعلق مضامین کے متعلق یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ روس اور فرانس میں جب معاہدے کی بات چیت ہو رہی تھی تب اسٹالن کے دباؤ کے تحت فرانسیسیوں کو خوش کرنے کے لیے لکھے گئے تھے اور اس لیے سرے سے قابل اعتقاد ہی نہیں ہیں۔ میں اس بات سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتا اور پچھلے باب میں اس سے بحث بھی کر چکا ہوں لوکاچ نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بہت سے

مضامین اس نے اس خوفناک دور کے دباؤ میں لکھے نہ صرف یہ بلکہ اس نے اس دباؤ کی اور اس دباؤ کے تحت تخلیق کیے گئے ادب کی مذمت بھی کی ہے۔ لوکاچ نے SOLZHENITSYN کے ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے اسٹالن کے اپنائے ہوئے طریقوں کی مذمت کی ہے اور انھیں بے نقاب کرنے پر مصنف کی تعریف بھی کی ہے۔

سولزینیتسین کے ناولوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جگہ لوکاچ لکھتا ہے:

"اسٹالن کے دور کے نئے تقاضوں کے مطابق ادب کا سیاسی رول آشکارا ہوا۔ جہاں ادب کی ذمّے داری یہ تھی کہ وہ بعض عصری سیاسی مسائل کے حل کے لیے ایک واضح اور یقینی لائحہ عمل پیش کرے۔ ادب کی قدر یا بے قدری کا انحصار اس بات پر تھا کہ مسائل کے جو حل اس کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں وہ عملی زندگی میں صحیح سیاسی فیصلوں کے لیے راستہ ہموار کرنے میں کہاں تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں اس اعتبار سے سچّے ادب کو پرکھنے کا ضروری معیار متعین کرنا اس وقت کسی حد تک دشوار نہیں تھا۔ جائز سیاسی اقتدار کے جدید ترین فیصلے ہی اس کا معیار تھے۔ اگر کسی تصنیف کے دوران سیاسی موقف میں تبدیلی آتی تھی تو اس تصنیف کے کرداروں اور ان کے انجام کی از سرِ نو تشکیل کرنی پڑتی تھی تاکہ وہ نئے سیاسی موقف کی حامل ہو سکیں۔"

لوکاچ کی کتاب سے یہ طویل اقتباس پیش کرنے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ لوکاچ اس مسئلے کی اہمیت اور اس دباؤ سے پیدا ہونے والے مسائل سے اچھّی طرح واقف تھا۔ بعض نقادوں کا لوکاچ سے یہ مطالبہ ہے کہ اس نے اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے اس دور میں اسٹالن کے خلاف کیوں نہیں لکھا یا کم از کم خاموشی کیوں اختیار نہیں کی۔ لوکاچ کی طرف سے معذرت کرنے کا سوال نہیں ہے۔ لیکن لوکاچ کی اس دور کی مشکلات کو ہمارے سامنے نہ رکھنا بھی اس سے ناانصافی ہوگی۔ لوکاچ اپنے ملک میں انقلابی تحریک میں حصہ لیتا تھا اور اسی جرم میں اسے اپنا وطن ترک کر کے پہلے ویانا اور بعد میں روس میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ اگر روس میں بھی، جہاں وہ پناہ گزیں تھا، اسٹالن کا عتاب نازل ہوتا

(لوکاچ اس عتاب سے کئی بار بال بال بچا ہے) تو وہ کہیں کا نہ رہتا۔ بہر حال ہم اسے اس کی اخلاقی کمزوری قرار دیں یا اس کی مجبوری، اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لوکاچ کی تحریروں پر اسٹالن کے دور کے خوف کا سایہ ضرور پڑا ہے۔

لوکاچ اپنی کتاب WRITER AND CRITIC کے دیباچے میں کہتا ہے کہ حالانکہ اس کتاب میں شامل مضامین اس صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے میں لکھے گئے تھے جب روس میں اسٹالنزم کا دور دورہ تھا، پھر بھی یہ پارٹی لائن کے دباؤ سے بچ کر لکھے گئے ہیں۔ لوکاچ کہتا ہے : "ہر شخص جانتا ہے کہ اس دور میں کھلم کھلا مناظرہ ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی میں برابر ادب کے اس قسم کے تصور کے خلاف احتجاج کرتا رہا۔ مارکس اور لنین کے پیچیدہ جدلیات کے متعلق خیالات کا احیاء جو رائٹروں کے سیاسی اور سماجی موقف اور ان کے اعمال کے درمیان تضادات سے بھرپور تھے۔ ZHDANOV کیے تجویز کردہ نسخے کے خلاف تھا۔ بالزاک اور ٹالسٹائی پر تجزیاتی مضامین کے ذریعہ میں نے نہ صرف سرکاری لائن کے خلاف نظریہ پیش کیا بلکہ نتیجتاً سرکاری ادب کی تنقید بھی کی۔ بہت سی دستاویزی شہادتوں سے بھی یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جن کی میں تنقید کر رہا تھا وہ بھی اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ میں کیا کر رہا ہوں" (لوکاچ رائٹر اینڈ کریٹک صفحہ ۷)۔ ہمیں لوکاچ کے حق میں یا اس کے خلاف فیصلہ کرتے وقت اس بات کو بھی اچھی طرح خیال میں رکھنا ہوگا جو وہ خود اپنے متعلق کہہ رہا ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں ہوسکتا کہ لوکاچ ایک اہم مارکسی دانشور تھا جس نے مارکسی فکر کو یقیناً بہت کچھ دیا ہے اور جس کی مارکسی فکر سے مخلصانہ وابستگی پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا۔

ادب اور جمالیات مارکسی نقطۂ نگاہ سے لوکاچ کے محبوب ترین موضوع تھے اس پر اس کی تحریریں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اور بہت کچھ اس نے جرمن زبان میں لکھا ہے جس کا ترجمہ ہونا باقی ہے۔ انگریزی میں بھی جو ترجمہ ہوچکا ہے سینکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ہم یہاں اس کے ادبی و جمالیاتی نظریات کے چند پہلوؤں سے ہی بحث کر سکتے ہیں۔ لوکاچ گوئٹے کے اس مقولے پر پورا یقین رکھتا ہے کہ "اگر انسانیت زوال پذیر ہو تو ادب بھی زوال پذیر ہوتا ہے"۔ اس کی جدیدیت پر پوری تنقید اسی نقطۂ نگاہ سے ہے۔ پہلے ہم جدیدیت اور سوشلسٹ ریلزم سے متعلق لوکاچ کے نظریئے سے بحث کریں گے۔ اس سے ہمیں لوکاچ کے ادبی موقف کو

سمجھنے میں کافی مدد دے گی ۔ لوکاچ کا موقف جو کچھ بھی ہو انتہا پسندانہ ہرگز نہیں ہے ۔ وہ جدیدیت کی فلسفیانہ بنیاد کی سخت تنقید کرتا ہے مگر کافکا جیسے جدید ادیبوں کے بعض فنی کمالات اور تخلیقی عظمت کا اعتراف بھی کرتا ہے ۔ وہ جدیدیوں کے موقف کو اور اں گارڈ ادب ہی جدیدیت کی صحیح نمائندگی کرتا ہے ۔ اور یہ کہ روایتی حقیقت پسندآج کے دور کی سچائیوں کو پیش نہیں کر سکتا ۔ اور دوسری طرف یہ خیال کہ سوشلسٹ ریلزم نے انتقادی حقیقت نگاری CRITICAL REALISM کو بے کار کر دیا ہے، یہ دونوں ہی رویئے جدید بورژوا ادب کے سونولیتھی نظریئے پر مبنی ہیں اور اس طرح یہ ہماری ادبی اور ثقافتی زندگی کی اہم حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔

لوکاچ کا یہ خیال ہے کہ یہ دونوں رویئے ہمارے دور کے حالات میں اپنی جڑیں رکھتے ہیں ۔ اور یہ کہ ۱۸۴۸ء کے پیرس پرولتاریہ کی بغاوت سے لے کر ہمارے جدید دور تک سوشلزم اور سرمایہ داری نظام کے درمیان جدوجہد ایک بنیادی حقیقت رہی ہے ۔ ہمارا ادب اور تنقید بھی اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ ہر فنی تخلیق یا ثقافتی واقعہ براہ راست اس جدوجہد کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ سرمایہ داری اور سوشلزم کے لیے جدوجہد ہمارے دور کا تشکیلی اصول ہو سکتا لیکن روزمرّہ کی جدوجہد کے مظاہر کو، یا طویل المدت رجحان کو سیدھا اس سے جوڑ دینا بھی گمراہ کن ثابت ہو سکتا ہے ۔ جدیدیت کے سیاق میں لوکاچ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے سماج واد اور سرمایہ داری میں ٹکراؤ اتنا فیصلہ کن نہیں تھا جتنا کہ فاشسٹ اور فاشسٹ مخالف طاقتوں میں تصادم ۔ اس دور میں فاشسٹ اور فاشسٹ مخالفوں میں ٹکر زیادہ حرکی اور فوری ٹکر تھی ۔ ٹامس من حالانکہ بورژوا ادیب تھا لیکن فاشزم کا مخالف تھا اسی لیے لوکاچ اس کا بہت احترام کرتا ہے اور چونکہ کافکا کی طرح اضطراب ANGUISH اور مایوسی DESPAIR کو اس نے اپنی تصنیفات کا مرکزی نقطہ نہیں بنایا اور انتقادی حقیقت نگاری کو روایت پر قائم رہتے ہوئے فاشزم کے مقابلے میں صف آرا ہوا ۔ اس لیے لوکاچ ٹامس من کو ٹالسٹائی کی صف میں لا کر کھڑا کرتا ہے ۔ کافکا اور ٹامس من سے متعلق لوکاچ کے خیالات جدید ادب کی تنقید میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اس سے ہم بعد میں بحث کریں گے ۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جدیدیت کی بنیاد " آئیڈیالوجی کی موت " پر ہے ۔ دوسرے لفظوں میں جدیدیت کسی بھی آئیڈیالوجی کی قائل نہیں ہے ۔ یہ ایک منفی رجحان ہے جو زندگی

کی ہر مثبت قدر سے بیزار ہے۔ لوکاچ اس بات کا قائل نہیں ہے کہ جدیدیت کی کوئی نظریاتی بنیاد نہیں ہے۔ دراصل "آئیڈیالوجی کی موت" خود ایک منفی نظریہ ہی ہے (فلسفیانہ نہ ہی) جو دوسرے زندگی کے مثبت نظریوں کے مقابلے میں اختیار کیا گیا ہے۔ جدیدیت محض نئی اسٹائل یا نئی تکنیک کا نام نہیں ہے۔ اگر محض نئی تکنیک یا نیا اسلوب اختیار کرنے کا نام جدیدیت ہو تو یہ بات قابل اعتراض نہیں ہو سکتی۔ بنیادی سوال تو زندگی اور انسانی سماج کی طرف رویے کا ہے۔ تکنیک یا اسلوب ایک ہی ہو سکتا ہے مگر زندگی کے بنیادی سوالوں کی طرف رویہ اگر مختلف ہو تو بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ لوکاچ اس کی مثال جیمس جوائس کے ناول ULYSSES اور ٹامس من کے ناول LOTTE IN WEIMAR کے کلیدی کرداروں سے دیتا ہے۔ دونوں ناولوں میں داخلی خود کلامی INTERIOR MENELOGUE کی تکنیک استعمال کی گئی ہے ULYSSES کے شروع میں بلوم کی بیت الخلا میں خود کلامی اور اس کے آخر میں مسولی کی بستر میں خود کلامی کا موازنہ اگر ہم ٹامس من کے LOTTE IN WEIMAR میں گوئٹے کی علی الصبح خود کلامی سے کریں تو تکنیک کے اعتبار سے تو ہمیں کچھ فرق نظر نہیں آئے گا مگر پھر بھی ان دونوں ناولوں سے زیادہ مختلف ناول نہیں ہو سکتے۔ جس میں جوائس کے یہاں شعور کی روح کی تکنیک سب کچھ ہے وہ اس ناول کا تشکیلی جمالیاتی اصول بھی ہے جو اس کے بیان اور کردار پر چھایا ہوا ہے اور اس کا مقصد بھی گویا تکنیک یہاں مطلق اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے برخلاف ٹامس من کے لیے داخلی خود کلامی کی تکنیک محض ایک ذریعہ ہے گوئٹے کی دنیا کے مختلف پہلوؤں کے انکشاف کا جو اس تکنیک کے استعمال کے بغیر ممکن نہ ہوتا۔ فنکار اس طرح اپنے کردار کی شخصیت کی گہرائی میں اتر جاتا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل سے اس کی شخصیت کے پیچیدہ رشتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ مصنف نے اس داخلی خود کلامی کو بڑی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے شعور کے بہاؤ سے جو شخصیتیں اور واقعات ابھرتے اور غائب ہوتے ہیں وہ اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور کل سے جڑے ہوئے ہیں، یونہی اوٹ پٹانگ یا غیر مربوط نہیں۔ جس طرح جیمس جوائس کے یہاں ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پیش کرنے کی تکنیک روایتی تکنیک سے بالکل ہٹی ہوئی ہے پھر بھی کوشش زندگی اور سماج کے مسائل کو اپنی بھرپور پیچیدگیوں کے ساتھ ایک مثبت مناظر میں پیش کرنے کی ہے جس میں موجودات اور امکانات کے بیچ تناؤ محسوس ہوتا

رہتا ہے۔

لوکاچ کچھ بنیادی اور اہم سوال اٹھاتا ہے جس سے اس کے فنی نظریے پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک فن پارے کی اسٹائل کس بات سے طے پاتی ہے؟ فن کار کا ارادہ اس کے فن کی ہیئت کو کس طرح طے کرتا ہے؟ (لوکاچ اس ارادے کی بات کر رہا ہے جو فن پارے کے ذریعہ منعکس ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ فن کار کا شعوری ارادہ ہی ہو۔) اسلوبی تکنیک کے امتیاز کی ہم یہاں بات نہیں کر رہے ہیں۔ جو بات اہم ہے وہ ادیب کا نظریہ ہے، اس کا عالمی تناظر ہے، اس کی آئیڈیالوجی ہے۔ ادیب کے اس نظریئے کو اس عالمی تناظر کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کی کوشش ہی اس کا ارادہ ہے، اس کی تخلیقات کے تشکیلی اصولوں کا پس منظر ہے۔ لوکاچ کہتا ہے کہ اگر ہم اسٹائل کو اس اعتبار سے دیکھیں تو وہ محض رسمی چیز نہیں رہ جاتی بلکہ اس کی جڑیں ہمیں مواد میں ہی نظر آئیں گی گویا ہیئت اور مواد میں جدلی رشتہ ہے، خاص مواد کی خاص ہیئت ہوتی ہے۔ مواد ہی ہیئت طے کرتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا کوئی مواد نہیں ہے جس کا انسان مرکزی نقطہ نہ ہو۔ ایک فن کار جب نیچر کی کسی بھی شئے کے متعلق لکھتا ہے تو انسان سے رشتہ جوڑ کر ہی لکھتا ہے۔ انسان سے کٹ کر نیچر کی کوئی شئے بھی کچھ معنیٰ نہیں رکھتی۔

جدیدیت میں انسان اور انسانی رشتوں کی طرف منفی رجحان ہے۔ اس لیے یہاں انسانی رشتوں سے بحث کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اور خاص طور سے جب ہم انسان کو ادب کا FOCAL POINT قرار دیں۔ بنیادی سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ حقیقت پسند ادب ارسطو کے اس مقولے کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان سماجی جانور ہے۔ یہ بات دنیا کے عظیم ادب پر لاگو ہوتی ہے۔ انسان کا ذاتی وجود، اس کا حقیقی وجود ONTOLOGICAL BEING سماجی اور تاریخی ماحول سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اس کے وجود کی اہمیت سماج اور تاریخ کے دھارے میں ہی مل کر طے ہوتی ہے۔ سماجی سیاق سے کٹ کر انسان کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جدیدیت کے حامی بڑے فنکاروں کے یہاں انسان کا تصور اس کا بالکل الٹ ہے۔ ان فنکاروں کے نزدیک انسان فطرتاً تنہا، غیر سماجی اور دوسرے انسانوں کے ساتھ گہرا اور معنوی رشتہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ لوکاچ THOMAS WOLFE کا اس کے ثبوت میں بیان نقل کرتا ہے۔ WOLFE نے ایک

جگ لکھا ہے:

"دُنیا کے بارے میں میرا جو نظریہ ہے اس کی بنیاد اس پختہ یقین
پر ہے کہ تنہائی کوئی ایسی غیر معمولی صورتِ حال ہیں جو صرف میری ذات
سے مخصوص ہو یا جس کا تعلق چند خاص قسم کے تنہا انسانوں سے ہو بلکہ یہ تو
انسانی وجود کی ایک ناگزیر اور مرکزی حقیقت ہے"

اس نظریئے کے اعتبار سے انسان سے بالکل سطحی یا حادثاتی رشتہ قائم کر سکتا ہے کوئی گہرا یا بامعنی رشتہ نہیں۔ تنہائی کا تصور حقیقت پسند ادب میں بھی رہا ہے۔ مگر جدیدیت میں اس کی اہمیت بالکل دوسری ہے۔ تنہائی مخصوص حالات یا کردار کی اپنی داخلی نفسیاتی خصوصیت کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ عالمی ادب میں ہمیں ایسے کئی کردار مل جائیں گے جو یا تو حالات کی مجبوری کی وجہ سے جیسا کہ روبن سن کروسو یا داخلی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے جیسا کہ ٹالسٹائی کا کردار IVAN ILYITSCH تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تنہائی محض ایک مرحلہ ہوتی ہے زندگی کے طویل سفر کا یا ایک گذرتی ہوئی کیفیت ہوتی ہے کردار کے نفسیاتی مزاج کی۔ لیکن جدیدیت میں تنہائی کا تصور بنیادی اہمیت رکھتا ہے گویا یہ انسان کا مقدر ہے CONDITION HUMAINE' اور گویا یہ زندگی کی ناقابل تغیر حقیقت ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ مارٹن ہائیڈ گیر نے انسانی وجود کے متعلق کہا تھا کہ یہ THROWNNESS-INTO-BEING وجود میں پھینکا جاتا ہے۔ انسانی تنہائی کا اس سے زیادہ وجودی اعتبار سے کیا ۔ ۔ ۔ ۔ بیان ہو سکتا ہے۔ انسان وجود میں پھینک دیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ فطری اعتبار سے وہ اپنی ذات سے باہر دوسری اشیاء کا یا دوسرے اشخاص سے کوئی بامعنی رشتہ قائم نہیں کر سکتا۔ نہ صرف یہ بلکہ نظریاتی اعتبار سے اس کے آغاز اور انتہا کا کوئی مقصد بھی نہیں طے کیا جا سکتا۔

جدیدیت، انسان کو تاریخ کے دائرے سے بالکل باہر سمجھتی ہے، تاریخی ارتقاء اور سماجی تبدیلیاں، اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اس کے نزدیک انسان ایک جامد حیاتیاتی وجود ہے جس کا مقدر ناقابل تغیر ہے۔ ہائیڈ یگر نے تو تاریخیت کو بیہودہ قرار دیا ہے۔ جدیدیت میں تاریخ کی نفی دو صورتیں اختیار کرتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہیرو محض اپنے ذاتی تجربات ہی تک محدود رہتا ہے۔ اس کی اپنی ذات کے ماورا پہلے سے موجود کوئی حقیقت

نہیں ہے، جو اس پر اثر انداز ہوتی ہو یا جس پر وہ اثر انداز ہوتا ہو۔ دوسرے یہ کہ ہیرو کی اپنی بھی کوئی ذاتی تاریخ نہیں ہوتی۔ وہ اس وجود میں پھینک دیا گیا ہے، اور بس۔ اس کا وجود لا یعنی اور نا قابلِ فہم ہے۔ وہ خارجی دنیا سے تعلق پیدا کر کے ارتقاء کی منازل طے نہیں کرتا۔ جدید ادب کے لیے انسانی ارتقاء کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ انسان وہی ہے جو وہ تھا۔ اور ہمیشہ وہی رہے گا۔ لوکاچ جدیدیت کی اس فلسفیانہ اور نظریاتی بنیاد پر جہاں زور دیتا ہے وہاں اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ فلسفے کا مجرد عقیدہ ادب میں میکانکی طور پر نہیں برتا جاسکتا۔ لوکاچ کے الفاظ ہیں:

"کوئی ذہین فن کار، خواہ وہ جدیدیت کے بارے میں نظریاتی سطح پر کتنا ہی شدت پسند کیوں نہ ہو عملی سطح پر اسے تاریخ اور سماج کے تقاضوں کے ساتھ مفاصمت کرنی پڑے گی۔ جوائس نے ڈبلن کو اور کافکا اور موسل (MOSIL) نے HAPS BURG کے شہنشاہوں کو اپنے شاہکاروں کا مرکز بنایا تھا لیکن اس کے باوجود ان کے فنکارانہ ارادوں میں اس مرکز کو اساسی اہمیت حاصل نہیں تھی۔"

لوکاچ جدیدیت اور حقیقت نگاری سے بحث کرتے ہوئے ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک فنکار ہمیشہ امکانات سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ ہر آدرش آخر حقیقت ACTUAL کے مقابلے میں امکان POTENTIAL ہی ہوتا ہے۔ فنکار اور ادیب ان امکانات کو اپنا آدرش بناتے ہیں اور موجود کو اس امکانی پیمانے پر ناپتے ہیں لیکن امکان مجرد ABSTRAIT بھی ہوسکتا ہے اور ٹھوس CONCRETE بھی۔ فلسفے میں اس مجرد اور ٹھوس (ہیگل اسے حقیقی امکان کہتا ہے) امکانات میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ امکانات کی ان دو قسموں، ان کے آپسی رشتوں اور تضادات کی جڑیں ہماری زندگی میں ہی ہوئی تھیں۔ مجرد امکان — چونکہ موضوعی ہوتا ہے — حقیقی زندگی سے بہت زیادہ پرکشش اور مالا مال ہوتا ہے۔ انسانی ارتقاء کے کئی امکانات تصور کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم عمل میں لائے جاسکتے ہیں۔ جدید داخلیت ان داخلی امکانات کو حقیقی زندگی کی پیچیدگیوں کا بدل سمجھ لیتی ہے۔ اور اس طرح وہ مایوسی اور کشش کے درمیان ہچکولے لیتی رہتی ہے۔ جب حقیقی دنیا میں یہ امکانات غیر ممکن ہوتے نظر آتے ہیں تو یہ مایوسی،

یہ اداسی نفرت کا رنگ اختیار کرنے لگتی ہے۔ جدیدیت نے ایسے ہی مجرد امکانات کو اپنی بنیاد بنایا ہے اور جب حقیقت بالکل اس کے متضاد نظر آتی ہے تو انسان اور اس کے معاشرے سے اعتماد ہی اٹھ جاتا ہے۔ انسان ان امکانات کی آرزوؤں کو اپنے سینے سے لگائے تنہائی میں سسکتا نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقت نگاری میں ٹھوس امکانات پر زور ہوتا ہے۔ جنھیں سماج کی بنیادی ساخت میں تبدیلیاں کر کے عمل میں لانا ممکن ہوتا ہے۔ مشکلات، پیچیدگیاں یہاں تک کہ ناکامیوں کا بھی احساس ہوتا ہے مگر اس صورت میں ناقابلِ تغیر مایوسی اور تنہائی ایک فلسفیانہ اور حتمی صورت اختیار نہیں کر پاتی۔ لوکاچ کا جدیدیت پر بنیادی اعتراض یہی ہے کہ اس کی فلسفیانہ بنیاد اسی مایوسی اور تنہائی کے حتمی اور ناقابلِ تغیر احساس پر ہے۔ یہ محض حوصلہ شکن ہے حوصلہ پرور نہیں۔

لوکاچ جدیدیت پر یہ اعتراض بھی کرتا ہے کہ انسان کی تنہائی اور ایک دوسرے سے بامعنی رشتہ پیدا نہ کر سکنے کی مجبوری کو معروضی حقیقت قرار دے دیا جاتا ہے اور اس طرح مجرّد اور ٹھوس امکانات میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سارا زور اگر داخلیت پر ہو اور معروضی یا خارجی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے تو داخلی شخصیت مفلس ہو جاتی ہے۔ اگر مجرّد اور ٹھوس امکانات میں فرق ختم کر دیا جائے اور انسان کی داخلیت کو مجرد داخلیت کا مترادف سمجھ لیا جائے تو اس کی شخصیت یقیناً ٹوٹنے لگے گی۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ نے انسانی شخصیت کے اس طرح پیش کیے جانے کو یوں بیان کیا ہے :

SHAPE WITHOUT FORM, SHADE WITHOUT COLOUR

PARALYSED FORCE, GESTURE WITHOUT MOTION.

شخصیت کا یہ بکھراؤ پھر خارجی دنیا کے بکھراؤ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خارجی حقیقت ناقابل فہم قرار دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ جرمن شاعر GOTTFRIED BENN تو یہ موقف اختیار کرتا ہے کہ ”کوئی خارجی حقیقت نہیں ہے، صرف انسانی شعور ہے جو مستقل بنتا اور بدلتا رہتا ہے اور اپنی ہی تخلیقی سرگرمیوں کے نتیجے میں نئی نئی دنیائیں تعمیر ہوتی رہتی ہیں۔“ اس طرح MUSIL کے ناول THE MAN WITHOUT QUALITIES کا ہیرو ULRICH یہ پوچھے جانے پر کہ اگر وہ خدا بن جائے تو کیا کرے گا، جواب دیتا

ہے ' میں خارجی حقیقت کو مٹانے پر اپنے آپ کو مجبور سمجھوں گا !

خارجی حقیقت سے انکار ضروری نہیں ہے کہ اتنی ہی سختی کے ساتھ پورے جدیدی ادب میں کیا جاتا ہو. لیکن ایک نہ ایک شکل میں یہ اس کا جزو ضرور ہوتا ہے۔ لوکاچ اس بات کے ثبوت میں MUSIL کی ہی مثال پیش کرتا ہے۔ جب موسیل سے اس کے عظیم ناول کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ کب لکھا گیا تھا تو اس نے کہا کہ ۱۹۱۲ اور ۱۹۱۴ کے درمیان لیکن اس نے فوراً یہ کہہ کر اپنا بیان بدل دیا کہ " مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ میں نے کوئی تاریخی ناول نہیں لکھا۔ میرا حقیقی واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔ واقعات آپس میں بدلے جا سکتے ہیں میں صرف مثالی TYPICAL سے دل چسپی رکھتا ہوں جسے حقیقت کا خیال پہلو کہا جا سکتا ہے۔ لوکاچ موسل کے اس بیان میں لفظ ' GHOSTLY (غیر جسمانی) خیالی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہوئے کہتا ہے :

" جدیدیت پسند ادب میں یہ ایک اہم رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی واقعیت کی کو کم تر کرنا۔ کافکا کے یہاں جزئیات کا بیان غیر معمولی طور پر براہ راست اور مصدقہ ہے لیکن کافکا کی فن کارانہ اپج کا رُخ اس دنیا کی معروضی حقیقت کے بجائے اپنی بصیرت پیش کرنے کی جانب ہے. حقیقت پسندانہ تفصیل ایک غیر جسمانی ناحقیقت کا اظہار ہے یا ایسے خوابوں کی دنیا جس کا مقصد ANGST کو بیدار کرنا ہے "

جدید ادب سے متعلق لوکاچ کی یہ بات عام مشاہدے تک تو بالکل ٹھیک ہے مگر اس نے کافکار کی جو اس سلسلے میں مثال دی ہے اس سے پوری طرح اتفاق کرنا ذرا مشکل نظر آتا ہے۔ کافکا کی تخلیقات کرب، بے چینی ANGUISH یا اضطرار ضرور پیدا کرتی ہیں لیکن اسے محض کافکا کی داخلی دنیا کی GHOSTLY REALITY کہہ کر معاملے کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کافکا ایک بہت بڑا فنکار تھا یہ تو لوکاچ خود بھی تسلیم کرتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ نفسیاتی اعتبار سے کافکا دروں بین INTROVERT تھا۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ

کافکا کی تخلیقات اس کے داخلی فنطاسیہ کے سوا کچھ نہیں اس کے یہاں اضطراب کی جو لہر پائی جاتی ہے وہ بڑی حد تک اس کے اپنے عہد کی خارجی حالت کی بھی عکاسی ہیں۔ لوکاچ خود اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"کافکا ہوف من کے معاملے میں زیادہ سیکولر ہے۔ اس کے غیر جسمانی وجود روز مرہ کی بورژوا زندگی سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہ زندگی پہلے خود ہی غیر حقیقی ہے اس لیے اس میں ہوف من کے مافوق الفطرت بھوتوں کی گنجائش نہیں۔"

لیکن ساتھ ساتھ لوکاچ یہ بھی کہتا ہے جو ایک حد تک صحیح ہے :

"لیکن عالمی وحدت اس اعتبار سے چکنا چور ہو جاتی ہے کہ ایسی بصیرت کو جو لازمی طور پر داخلی ہے بجائے خود حقیقت تصور کر لیا جاتا ہے۔ سامراجی سرمایہ دارانہ نظام نے جو دہشت پھیلائی تھی اور جو بعد کے فسطائی نتائج کی دین تھی اس میں انسانوں کی اوقات محض اشیا کی سی ہو کر رہ گئی۔ یہ خوف اصلاً ایک داخلی تجربہ ہے جو ایک معروضی وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔"

اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ خارجی حالات ایسے تھے کہ انسان محض جنس بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک شے کی طرح برتاؤ کیا جانے لگا تھا۔ لیکن لوکاچ یہ کہتا ہے کہ خارجی عالم کا اتحاد تو ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ خارجی دنیا کے بکھراؤ نے کافکا میں داخلی بکھراؤ کا احساس پیدا کیا (میں یہی سمجھتا ہوں حالانکہ یہ بات بھی ہیں ذہن نشین کرنا ہوگی کہ کافکا بے حد حساس طبیعت کا مالک تھا اور بعض اوقات یہ مرض کی حدوں کو چھونے لگتی ہیں) یا داخلی احساس نے خارجی دنیا کو فن کے سامنے ٹوٹتے، بکھرتے ہوئے پیش کیا؟ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے درمیان جدلی رشتہ ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لوکاچ نے خود ایک جگہ THEODER. W. ADORNO کی زبانی کافکا کے متعلق یہ بات کہی ہے : "جس چیز سے دھچکا لگتا ہے وہ اس کا عجیب الخلقت ہونا نہیں بلکہ اس کی واقعیت ہے۔"

اس کے بعد لوکاچ خود ہی کہتا ہے کہ "جدید سرمایہ داری کی دنیا کا شیطانی کردار اور اس کے سامنے ایک انسان کی مکمل بے بسی، کافکا کی تحریروں کا حقیقی موضوع ہے، اس

لیے یہ کہنا غلط ہوگا کہ کافکا نے اپنی تحریروں میں جو خارجی حقیقت کی تصویر کشی ہے وہ محض اس کا داخلی وژن ہے یا یہ کہ " غلط بیانی کی عکاسی عکاسی کی غلط بیانی ہوجانی چاہیے "۔

لوکاچ کے کافکا کی طرف رجحان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف اس کی عظمت کا اعتراف بھی کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی جدیدیت سے نالاں نظر آتا ہے وہ اس کی تنقید کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ اس کے یہاں ANGUISH کی کیفیت چھائی ہوئی ہے اور یہ دُنیا کی طرف صحت مند رجحان نہیں ہے تو دوسری طرف وہ کیر کے گارڈ کا مقولہ نقل کرتے ہوئے کہ THE GREATER A MAN'S ORIGINALITY, THE MORE HE IS AT THE MERCY OF ANGS ——— کہتا ہے کہ کافکا بڑا ہی طبغراد دائرٹ تھا۔ کیر کے گارڈ کے معنی ہیں طبغراد، کافکا یہ ANGUISH بیان کرتا ہے اور ٹکڑے ہوتی ہوئی دنیا بھی۔ لوکاچ یہ بھی کہتا ہے کہ " کافکا کی تحریروں کی تاثیر اس کے جذباتی خلوص کا ہی نتیجہ نہیں ہے (حالانکہ یہ بات بھی ہمارے دور میں مشکل ہی سے نظر آتی ہے) بلکہ اس کی وجہ سے وہ سادگی ہے جس کے ساتھ وہ خارج دنیا کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

لوکاچ کی اس بات سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ کافکا اپنی تخلیقات میں جو کچھ پیش کرتا ہے وہ صرف داخلی اور خیالی باتیں نہیں ہیں بلکہ ان کا حقیقی خارجی دنیا سے تعلق ہے۔ مذکورہ بالا باتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ لوکاچ کا رویہ کافکا کی طرف تضادات سے مبرا نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک بات کی طرف اور اشارہ کرنا ضروری ہے۔ لوکاچ جدیدیت کی تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حقیقت کو اس مکتب خیال میں جامد تصور کیا جاتا ہے۔ یہ الزام جدیدیت پر پوری طرح عائد ہوتا ہے اور اس سے کافکا کو بھی مشکل ہی سے بری کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس بات کا بھی نتیجہ ہے کہ جدیدیت کے حامی ادب میں کسی تناظر کے قائل نہیں ہیں۔ گوٹ فریڈ بین نے تو جمود کو اپنے فنی پروگرام میں شامل کیا تھا۔ اس نے اپنے ایک شعری مجموعے کا نام ہی STATIC POEMS (جامد نظمیں) رکھا تھا۔ اس طرح تاریخ کی، ارتقاء کی اور تناظر کی نفی جدیدیت کا خاصہ بن جاتی ہے اور خارجی حقیقت کو ناقابل تغیر سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ THE WISE MAN IS IGNORANT OF CHANGE AND DEVELOPMENT HIS CHILDREN AND CHILDRENS' CHILDRER ARE NO PART OF HIS WORLD.

بین کے نزدیک مستقبل کے تصور کا انکار دانشمندی کی نشانی ہے۔ جمود کے اس الزام سے
ان جدیدیوں کو بھی بری نہیں کیا جا سکتا جو انتہا پسند نہیں ہیں کیونکہ ان کے یہاں بھی کسی
نہ کسی شکل میں خارجی حقیقت کو جامد ہی تصور کیا جاتا ہے۔ جمود کا تصور، وہ موسیل ہو یا گوٹ
فریڈ بین، بیکٹ ہو یا کافکا جدیدیت کا جز و لاینفک بن چکا ہے، دراصل یہ جدیدیت کے نظریئے
میں ہی پیوست ہے۔ اگر آج خارجی حقیقت ہمارے آدرشوں یا توقعات کے مطابق نہیں ہے
تو مستقبل میں بھی نہیں ہوگی اور ماضی میں بھی نہیں تھی۔ ظاہر ہے اگر آج خارجی حقیقت کے
اس تصور کو تسلیم کر لیا جائے تو نتیجہ مستقل مایوسی اور کرب و اضطراب ہی ہوگا۔ یہی وجہ ہے
کہ مایوسی اور کرب و اضطراب جدید ادب کے بنیادی ستون بن گئے۔ اس حد تک لوکاچ
کی کافکا پر تنقید جائز ہے۔ کافکا اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک عظیم فنکار تھا۔ مگر خارجی حقیقت
کو وہ جامد تصور کرتا تھا۔ حالات بدل کر کبھی بہتر ہوں گے اس کا عکس ہمیں اس کی تخلیقی فکر
میں کہیں نظر نہیں آتا۔

لوکاچ ہماری توجہ اس بات کی طرف بھی مبذول کراتا ہے کہ اگر خارجی حقیقت کو جامد تصور
کر لیا جائے تو REALISM اور NATURALISM میں امتیاز نہیں کیا جا
سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی جدیدیت کے حامی فنکاروں کے ہمیں نیچرلزم اور ریلزم میں کنفیوژن
نظر آتا ہے۔ بلکہ اکثر اس مکتب فن سے تعلق رکھنے والے فنکار نیچرلزم کی حدود سے آگے بڑھتے
نظر نہیں آتے (حالانکہ کافکا پر یہ الزام صادق نہیں آتا۔) ایسے فنکار اپنی تخلیقات میں خارجی
اشیاء کی تفصیل اور جزئیات پر بہت زور دیتے ہیں تاکہ ان کا فن پارہ خارجی حقیقت سے
بہت قریب نظر آئے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ان اشیاء کو جوں کا توں فطری حالت میں پیش
کرتے ہیں۔ ان میں حرکت اور تبدیلی کا بذات خود انسان کے سیاق میں CONTENT
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت نگاری REALISM اس قسم کی خارجی اشیاء
کی جامد تصویر کا نام نہیں ہے۔ خارجی اشیاء اور انسان کا ایک فعال اور حرکی کی رشتہ ہے۔
اور حقیقت نگار فنکار ان اشیاء کو اسی رشتے کی تمام پیچیدگیوں اور تغیرات کی روشنی میں پیش
کرتا ہے۔ اس کے نزدیک محض تکنیک چاہے وہ جیمس جوائس کی شعوری کی رو کی

تکنیک ہو یا بکٹ کے ڈراموں کی تکنیک ، اہمیت نہیں رکھتی ۔ تکنیک اور مواد کا گہرا تعلق ہے ۔ تکنیک اگر نئی حقیقتوں کو ان کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ پیش کرنے کا محض ایک وسیلہ ہے تو ادب کی دنیا میں کوئی تکنیک مردود قرار نہیں پا سکتی پھر وہ تلب ماہیت کی تکنیک ہو یا شعور کے رو کی تکنیک یا سریلزم کی ۔ کچھ مارکسی نقادوں نے تکنیک کو ہی ملعون قرار دے دیا اور یہ غلط ہے اور میکانکیت کا غماز ہے ۔

جدیدیت اور حقیقت نگاری کا فرق سمجھنے کے لیے ہمیں نظریاتی بنیادوں کا ہی سہارا لینا پڑے گا ۔ لوکاچ کہتا ہے کہ ہومر سے تھامس من تک تبدیلی اور ارتقاء حقیقت نگاری کی بنیاد رہے ہیں ۔ دستوئیفسکی کے ناول THE HOUSE OF THE DEAD میں ایک کردار کہتا ہے " اگر ہر اُمید منقطع ہو جائے اور کوئی مقصد بھی نہ رہے تو اکتاہٹ انسان کو درندہ بنا سکتی ہے ۔" انسانی زندگی مناظر اور معنی کے بغیر محض ایک بوجھ بن کر رہ جائے گی جسے وہ جانور کی طرح ڈھوتا رہے گا یا اکتا کر خودکشی کرے گا ۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں بڑی بھاری اکثریت اسی قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے ۔ لیکن بہتر زندگی کے لیے جدوجہد اور خوش آیند مستقبل کی امید ان کی زندگی کو بامعنی بنا دیتی ہے ۔ حالانکہ حالات واقعی بڑے ہی حوصلہ شکن ہیں ۔ لوکاچ کے نزدیک ادب کے مسئلے کے تحت اخلاقیات کا گہرا مسئلہ ہے جس کی ادبی تحریر میں عکاسی ہوتی ہے ۔ ہر انسانی عمل فاعل کے نزدیک ایک معنی رکھتا ہے یا کم از کم فاعل یہ معنی فرض کرتا ہے ۔ اس معنی کی غیر موجودگی عمل کو مضحکہ خیز بناتی ہے اور ادب محض فطری بیان بن کر رہ جاتا ہے ۔

اس لیے لوکاچ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ تبدیلی اور ارتقاء کے بغیر ادب وجود میں نہیں آسکتا ۔ لیکن وہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اس بات کو مابعد الطبیعیات کے تنگ اور محدود معنی میں نہیں سمجھنا چاہیے ۔ ہم نے دیکھا کہ جدیدیت میں PSYCHOPATHOLOGY سرمایہ دارانہ نظام سے فرار اختیار کرنے کی مریضانہ خواہش کی شکل اختیار کرتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جدیدیت موجودہ صورت حال کی مطلق اولیت کو تسلیم کرتی ہے اور اسی نقطۂ آغاز کو انجام سمجھ لیتی ہے ۔ اس سے آگے بڑھ کر اگلی منزل تک پہونچنے کا امکان ہی نہیں رہتا ۔ اس سے وہ انسان کو بے بس تصور کرتی ہے ۔ اکثر جدیدیت کے حامی خارجی حقیقت کو قطعاً ناقابل تغیر سمجھتے ہیں اور اس طرح ہر انسانی عمل کو ابتدا ہی سے ہر قسم کی معنویت سے محروم کر دیتے ہیں ۔ اس طرح ہم

دیکھتے ہیں کہ جدیدیت پر مایوسی ادبی علی چھائی ہوئی ہے اور انسان مجبور محض یا حالات کا ایک کھلونا
بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ سب کچھ ایک فیشن کے طور پر ادب میں در آیا ہے۔
اس رجحان کی جیسے کہ ہم اوپر بھی دیکھ چکے ہیں گہری نظریاتی بنیادیں ہیں۔

جدیدیت میں، لوکاچ ہماری توجہ اس طرف بھی مبذول کراتا ہے کہ زمان کا نظریہ بھی
داخلی اور موضوعی ہے۔ زمان کی کوئی معروضی اور خارجی حقیقت نہیں تسلیم کی جاتی۔ موضوعی تصور
نے زمان کو تاریخی عمل سے فلسفے کے میدان میں پہلے ہی سے الگ کرکے رکھ دیا تھا۔ سامراجی
دور میں برگساں نے زمان اور تاریخی عمل کی اس خلیج کو اور گہرا کر دیا۔ موضوعی زمان، تجربے میں
آیا ہوا زمان ہی اب حقیقی زمان بن گیا اور خارجی یا معروضی زمان سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا
برگساں اور دوسرے فلسفیوں نے یہ دعویٰ کیا کہ موضوعی زمان ہی وقت کا صحیح عرفان کراتا ہے۔
ادب میں بھی یہ رجحان بہت جلد پیدا ہو گیا۔ اقبال بھی زمان کے اس تصور سے خاصے متاثر تھے
برگساں کا نظریہ زمان اُن کے لیے خاصی کشش رکھتا تھا۔ اور وہ پیرس خاص اسے ملنے کے لیے
گئے اور انہیں یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس کا نظریہ اسلامی نظریہ زمان سے بہت ملتا جلتا
ہے۔ اگر زمان کا یہ موضوعی نظریہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر تاریخی عمل، تبدیلی اور ارتقا کی کوئی
اہمیت نہیں رہ جاتی نہ ہی تبدیلی کی کسی سمت کا ہی سوال رہ جاتا ہے۔ اس موضوعی نظریے
کو اپنانے سے جو صورت حال پیدا ہوتی ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لوکاچ والٹر
بنجامن کی پراوسٹ کے ناول پر کی گئی تنقید کی مثال پیش کرتا ہے۔ پراوسٹ کے ناول پر تبصرہ
کرتے ہوئے والٹر بنجامن لکھتا ہے:

> "ہم سب جانتے ہیں کہ پراوسٹ ایک انسان کی زندگی کو اس طرح بیان نہیں
> کرتا جس طرح وہ واقعتاً گزرتی ہے بلکہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ جس طرح وہ
> اس انسان کو یاد رہتی ہے جو اس زندگی سے گزرا ہے۔ پھر بھی یہ تفسیر
> خاص کھردری ہوتی ہے کیوں کہ اصل تجربہ اتنا اہم نہیں جتنا کہ گزرے ہوئے واقعات
> کی یادوں کا وہ لبادہ ہے جسے انسان کی یادداشت کہا جاتا ہے۔"

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس رویئے کا برگساں کے نظریئے سے تعلق ہے لیکن
کم از کم برگساں کے نظریئے میں مشاہدے کا اتحاد قائم رہتا ہے۔ لیکن پروسٹ کے یہاں

زمان کا تسلسل نہ ہونے کی وجہ سے معروضیت بالکل قائم نہیں رہ پاتی ۔ پروسٹ کہتا ہے :

" زندگی کا کوئی واقعہ ایک محدود چیز ہے جو ہر اس چیز کو سمجھنے کا ایک امکانی ذریعہ ہے جو پہلے وقواع ہو چکی ہے یا آئندہ وقوع پذیر ہونے والی ہے "

فلسفے میں تصوریت کے اثر کے تحت زمان و مکان کے تصور کو معروضی خلا کی مخصوصیت سے آزاد کرانے کی کتنی بھی کوشش کی گئی ہو ، ادب میں ان کا اتحاد برابر قائم رہا ہے ۔ لیکن جدیدیت میں آدرش واد غالب آیا اور پہلی مرتبہ ادب کے میدان میں زمان و مکان کا داخلی اور موضوعی تصور استعمال کیا گیا ۔ زمان کو معروضی حقیقت سے الگ کر کے فن کار نے اپنی داخلی دنیا پیدا کی اور اس طرح خارجی دنیا کو ایک ناقابل فہم داخلی معمے میں تبدیل کر دیا جو اپنے ظاہرہ داخلی بہاؤ کے باوجود جامد کردار کا حامل ہے ۔ زمان کو اس طرح داخلی دنیا کا حصہ بنا دینے سے جس کا معروضی تسلسل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ، خارجی دنیا بھی پارہ پارہ ہونے لگتی ہے ۔

اس سے قبل حقیقت پسند ادب میں ، حقیقت کی کڑی تنقید کے باوجود خارجی دنیا کا اتحاد اور اس کی معروضیت ہمیشہ قائم رہی ۔ لوکاچ کہتا ہے کہ ہمارے دور کے بعض بڑے حقیقت نگار ادیبوں نے جان بوجھ کر بکھراؤ کا عنصر داخل کیا ــــ مثال کے طور پر زمان کو داخلی روپ دینا ــــ اور اسے ہمارے دور کی حقیقت کی تصویر پیش کرنے کے لیے استعمال کیا ۔ اس طرح فطری اتحاد شعوری اور تعمیر کیا ہوا اتحاد بن جاتا ہے ۔ (یہاں لوکاچ ہماری توجہ ٹامس من کے ڈاکٹر فاؤسٹس کی طرف کھینچتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے درمیانی زمان کی ترکیب استعمال کر کے اس کی تاریخیت پر زور دیا ہے) ۔ لیکن جدیدیت میں زمان کی داخلیت پر نظریاتی اعتبار سے زور ہے کسی تکنیک یا ترکیب کے طور پر نہیں اور اس کے نتیجے میں خارجی دنیا یا تو بالکل بکھر جاتی ہے یا ایک ہی نقطے پر ٹھہر جاتی ہے ۔ اضطراب اور کرب جو جدیدیت میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں ، اسی بکھراؤ کے احساس سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اس پارہ پارہ ہوتی ہوئی دنیا میں انسان زندہ رہنے کے لیے پھینک دیا گیا ہے ۔ خارجی دنیا بنتی ہے یا بگڑتی ہے اس سے کیا سروکار ؟ ان تمام باتوں سے لوکاچ آخر میں جدیدیت کے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ :

" جدیدیت کا مطلب فن کا فروغ نہیں بلکہ اس کی نفی ہے "

لیکن یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ لوکاچ نے جدیدیت کے متعلق کوئی یک طرفہ نتیجہ اخذ کیا ہے وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتا تھا کہ جدیدیت ایک حد تک ہمارے دور کی خارجی

حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مضمون FRANZ KAFKA OK
THOMAS MANN میں لکھتا ہے :

"اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ حقیقت ہے کہ جدیدیت پسند ادب کے
بہت سے عناصر جن میں کوئی بھی کم شدید نہیں ہے (مثال کے طور پر وقت
کا مسئلہ) عصری زندگی سے اتنے علیحدہ نہیں ہیں جتنے بظاہر نظر آتے ہیں۔
اس کے برعکس وہ حقیقت کے بعض پہلوؤں کی کم ازکم بعض عصری خصوصیات
اور بعض سماجی طبقوں کے انوکھے پن کی بہت اچھی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ صورتِ
حال حقیقت پسندی کے مخالف انتہائی پیچیدہ ادیبوں کے ہاں موجود ہے۔
داخلی ترنگ کے مطابق اسلوبیاتی تجزیہ حقیقت کو جان بوجھ
کر توڑ مروڑنے کا نام نہیں۔ یہ ان حالات کا ایک سلسلہ ہے جو موجودہ
دنیا میں جاری ہیں۔"

لوکاچ کی اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے کہ لوکاچ جدیدیت کی یک طرفہ یا میکانکی طور پر مذمت
نہیں کرتا بلکہ اسے صحیح تناظر میں دیکھتا ہے اور ایک باشعور مارکسی دانشور کی طرح اس کا معروضی
تجزیہ کرتا ہے۔ جدیدیت پر اس کا سب سے وزنی اعتراض یہی ہے کہ خارجی حقیقت کو جامد
تصور کرتی ہے اور موجودہ صورت حال کو ناقابل تغیر اسی لیے جدیدیت اگر موجودہ صورت حال کے
خلاف احتجاج بھی ہے تو یہ محض IMPOTENT احتجاج ہے، موثر احتجاج نہیں۔
لوکاچ جدیدیت کی مخالفت محض مخالفت کرنے کے لیے نہیں کرتا نہ ہی بغیر سمجھے سوچے ان
پر لیبل چسپاں کرنے کا قائل ہے۔ کچھ سوشلسٹ ریلزم کے حامیوں نے جدیدیوں کو رجعت پرست
اور دشمنوں کے ایجنٹ کے لیبلوں سے نوازا۔ لیکن لوکاچ کا یہ خیال ہے کہ جدیدیوں کی
اسٹالنی ادبی ڈوگما اور ہیت پرستی کو ٹھکرا دینے کی مخالفت کے مقاصد ملے جلے ہو سکتے ہیں۔
جدیدیت میں انتہا پرستی کا دفاع (جس میں اصل ہیئت پرست ادب شامل ہے) ہے تو وہاں
سوشلسٹ حقیقت نگاری میں موضوع کو سیدھا سادہ سمجھ لینے اور ڈوکٹر رویہ اختیار کرتے

ہوئے سوشلسٹ سماج کے تضادات کو نظرانداز کر کے بہتر انجام پر کہانی ختم کرنے طفلانہ کوشش
کے خلاف سخت ردِ عمل بھی ملتا ہے جو بالکل حق بجانب ہے۔ اس قسم کی مخالفت یہ صحیح
ہے، نقاد کو دوسری انتہا تک بھی لے جا سکتی ہے۔ اس قسم کی انتہا پسندی معروضی طور
پر غلط ردِ عمل ہے۔ لیکن کئی نقاد اس کا شکار ہو جاتے ہیں اور زوال پذیر فن کی زنگارنگی
ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یہی انتہا پسندی اسے اس نتیجے پر پہونچاتی ہے کہ سوشلسٹ
حقیقت نگاری فنکار کی آزادی کی ہی منکر ہے۔ وہ حقیقت نگاری اور مخالف حقیقت نگاری
کے رجحان کے درمیان جو عناد ہے اسے قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھتے۔ یہی نہیں سوشلسٹ
ریلزم اور انتقادی CRITICAL ریلزم کی جو خوبیاں ہیں انہیں بھی نظرانداز کر دیا جاتا
ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ دونوں مکتبوں میں انتہاپسند رویوں کی مخالفت کرتا ہے
اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ضرب المثل درمیانہ راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ دراصل اس کی کوشش
یہی ہوتی ہے کہ ادب میں موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے اور اسے تمام تر پیچیدگیوں اور
تضادات کے ساتھ پیش کیا جائے۔ لوکاچ کا خیال ہے — اور میں سمجھتا ہوں کہ لوکاچ اس
معاملے میں حق بجانب ہے۔ کہ اکثر جدیدیت کے حامی فنکار SUBJECTIVE DOGMA-
-TISM کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کی رسمی جدت یا تاثری طبعزادیت اسی قسم کے
ڈوگمیٹزم کا اظہار ہوتی ہے ارنسٹ یونگر، گونفرڈ بین، جیمس جوائس اور سیموئیل بیکٹ اپنے
رویئے میں اتنے ہی SCHEMATIC رہے ہیں جتنے کہ سوشلسٹ حقیقت نگار
گناہست کہ در شہر شما نیز کنند والی بات ہے۔

ایک ادیب یا فنکار معروضی حقیقت کو انسانی رشتے کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ اس
کے معنیٰ یہ ہیں کہ خارجی اور داخلی حقیقتوں میں بڑا گہرا اور پیچیدہ تعلق ہے۔ جدیدیت کا قائل
فنکار اپنے داخلی احساسات کو خارجی حقیقت کے مترادف سمجھ لیتا ہے اور اسی سے حقیقت
کا حصہ ہو جاتی ہے (ورجینا ورلف اس کی انتہائی مثال ہے)۔ ایک حقیقت نگار اس کے
برخلاف اپنے معاصر دنیا کے تجربے کو وسیع بنیادوں پر جانچتا ہے اور اسے ایک بڑی اور معروضی
حقیقت کا حصہ سمجھتے ہوئے اس پر اتنا ہی زور دیتا ہے جتنا دینا چاہیئے۔ اس کے برخلاف جدیدیت
کا حامی فنکار اپنے ذاتی تجربے کو یا حقیقت کے ایک حصے کو پوری اور جاوداں سمجھ لیتا ہے۔
لوکاچ اس کی مثال کامو کے ناول پلیگ سے دیتا ہے۔ کامو کے یہاں حقیقت کا صحیح تناظر

نہیں ملتا۔ اس کے ناول کے کرداروں کی زندگی بے سمت، بے مقصد اور ارتقاء سے محروم ہے۔ پلیگ ایک وقتی اور گذر جانے والی وبا نہیں بلکہ انسانی وجود کی ایک مستقل خصوصیت ہے جس سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہے۔ طاعون ظاہر ہے کاموں نے اس بیماری کو علامت کے طور پر کیا گیا ہے، انسانی وجود کا نام ہے کامو ہمیں ایسا باور کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا انسانی سماج ہمیشہ سے اس وبا میں مبتلا تھا اور مبتلا رہے گا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کامو بھی جو جدیدیت کا اہم نمائندہ ہے۔ سماجی تغیر اور ارتقا کو صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ سماج اس کے نزدیک ایک ہی حالت میں ہے اور رہے گا۔ اس سے کوئی مفر نہیں ہے دوسرے لفظوں میں انسان عمل اور تبدیلی کے لیے ہر قسم کی جدوجہد لایعنی ہے۔

فرینچ نقاد MAURICE NADEAU سیمول بیکٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اس کی (یعنی بیکٹ کی) تخلیقی پیشکش نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس نے بیکٹ سے روایتی ادب کا میدان چھڑوا دیا اور اسے ظلمت کے علاقے کی گہرائیوں میں اتارتا چلا گیا حتیٰ کہ وہ اس سرحدی علاقے میں پہونچا جہاں زبان ناکام ہو جاتی ہے، جہاں زندگی اور موت ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔ جہاں وجود اور شعور تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اور تلاش کا راستہ خموشی کے دیوان خانے تک پہونچتا ہے جو اصل حقیقت ہے۔"
فرانسیسی نقاد کا بیکٹ کی تخلیق کے متعلق بیان جدیدیت کے اصل رجحان کی غمازی کرتا ہے۔ جدیدیت پرست ادب میں اکثر علامتیں انسانی معاشرے کی اسی ڈراؤنی حقیقت کو پیش کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ نادو یہ بھی کہتا ہے کہ "لاشیئت میں لپٹے ہوئے ہم ایسا بلبلہ ہیں جو گدلے تالاب کی سطح پر آ کر پھوٹتا ہے اور ہلکی سی آواز پیدا کرتا ہے۔ جسے ہم وجود کہتے ہیں۔" پھر NADEAU بیکٹ سے متعلق یہ رائے دیتے ہوئے اپنا مضمون ختم کرتا ہے۔ "بیکٹ کے یہاں انکاریت NIHILISM فاتحانہ انداز میں فن پارے میں سما جاتی ہے اور وہ شے جو تخلیق کرتی ہے اسے لایعنیت کے غبار میں تحلیل کر دیتی ہے۔ آخر میں مصنف نہ صرف کچھ نہ کہنے کے اپنے مقصد کی وضاحت کر دیتا ہے بلکہ کچھ بھی نہ کہنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہمارے کانوں میں اس کی آواز دراصل ہماری ہی آواز ہوتی ہے۔ جسے بالآخر ہم پا لیتے ہیں۔" دراصل جدیدیت کے نقاد کی یہ چونکا دینے والی باتیں جدیدیت کے اس نظریے کا منطقی نتیجہ ہے جو اس کی بنیاد ہے

دراصل لوکاچ اس نظریئے کی نفی کرتا ہے نہ کہ جدیدیت کی بذاتِ خود اس کی تنقیدی تحریروں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ادیبوں، فنکاروں سے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوکاچ سماجی مسائل کے حل کی کوئی توقع رکھتا ہے۔ یہ تو بڑی ہی طفلانہ بات ہوگی اور خود مارکس اور اینگلس نے اس قسم کے توقعات کی بڑی سخت تنقید کی ہے اور لوکاچ جیسا مارکسزم سے گہری واقفیت رکھنے والا اسکالر اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ لوکاچ صرف یہ چاہتا ہے کہ تخلیقی فنکار اپنے عہد کے سماجی اور معاشی مسائل ان کی پیچیدگیوں اور تضادات سے اچھی طرح واقف ہوں اور تبدیلی کے امکانات سے بھی اگر وہ اپنی تخلیقات میں صحیح سوال اٹھاتے ہیں تو یہی کافی ہے۔ ابسن کہتا ہے " میرا تعلق سوالات اٹھانے سے ہے، جواب فراہم کرنے سے نہیں " اور چیخف اعلان کرتا ہے " رائٹر جو سوال اٹھاتا ہے وہ معقول ہونے چاہئیں۔ بہت سی بار تو ٹالسٹائی بھی غلط جواب فراہم کرتا ہے لیکن اس سے اس کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی بشرطیکہ صحیح سوالات اٹھائے گئے ہوں " لوکاچ ابسن اور چیخف دونوں سے اتفاق کرتا ہے کیونکہ صحیح تناظر پیدا ہوتا ہے۔

پوسٹ انڈسٹریل سوسائٹی نے نئے سماجی مسائل پیدا کیے ہیں۔ ان مسائل کا تعلق زیادہ تر تو مغربی ممالک سے ہی ہے۔ یہ پچھلی چند دہائیوں میں ان مغربی ممالک میں بہتات AFFLUENCE کا مسئلہ کافی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم نے جو داہی تباہی مچائی تھی اس سے لوگوں کا ہر نظریہ سے اور ہر اخلاقی نظام سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ اسی کا منفی ردِ عمل ادب اور آرٹ کی دنیا میں جدیدیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ہر چیز مہمل نظر آنے لگی۔ لیکن پوسٹ انڈسٹریل سوسائٹی نے ان ممالک میں مادی اشیاء کی بہتات پیدا کر دی ہے اور اس سے جو نیا سماج وجود میں آیا ہے۔ اسے صارفی سماج CONSUMER SOCIETY کا نام دیا گیا ہے۔ مادی اشیاء کی اس ریل پیل نے جو بالکل بے سمت اور بے مقصد ہے، سماج میں نئی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ مادی اشیاء کا زیادہ سے زیادہ حصول اور صرف زندگی کا مقصد بن کر رہ گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں کسی قسم کی اخلاقی پابندی نہیں رہتی۔ روایتی اخلاق کا ٹوٹ جانا اور اس کے خلاف بغاوت ہونا اور بات ہے لیکن کسی بھی قسم کے اخلاقی اقدار سے انکار

بالکل دوسری بات ہے۔ مغربی ممالک میں ٹھیک یہی بات ہوئی ہے۔ ہر قسم کی اخلاقی اقدار کی مکمل نفی کی جا رہی ہے جو زندگی کو مہمل اور بے معنی بنا دیتا ہے۔ روایتی خاندانی نظام اور جنس کو روایتی ازدواجی رشتے تک محدود رکھنے کے خلاف بغاوت بالکل دوسری اہمیت رکھتی ہے لیکن جنس کو INSTANT COFFEE کی طرح INSTANT SEX جہاں مقصد صرف جنسی شہوت پوری کرنا ہو۔ بنا دینا انسانی رشتوں کی توہین ہے۔ لیکن مغربی ممالک میں یہی ہوا ہے عورت محض ایک جنسی شہوت پوری کرنے کا آلہ بن کر رہ گئی ہے۔ ظاہر ہے اس کا اثر جدید ادب نے بھی قبول کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ D. H. LAWRENCE نے اپنے ناول میں جنس کو محبت کی کیفیت سے محروم کر کے جنسی اعضاء کی شہوت بنا دیا ہے۔ ہنری ملر HENRY MILLER نے تو اسے بالکل دوسری انتہا تک پہونچا دیا ہے۔ جرمن نقاد HELMUT UHLIY ملر کی دنیا کا یہ نقشہ پیش کرتا ہے :

> دو کام سے نفرت کرنا، شراب خوری، مباشرت کو زندہ رہنے کا جواز سمجھنا آزادانہ جنسی تعلقات کو طرزِ زندگی بنانا اور دہشت پسندی پر تمام اطوارِ زندگی کا انحصار ہے۔"

اور بلغ ہنری ملر کے ذاتی تجربے سے متعلق یہ خیال ظاہر کرتا ہے :

> "دنیا ایک ایسی المیہ عریاں فلم لگتی تھی جس کا مرکزی خیال نامردی ہو۔"

یہ انتہا پسندانہ رویہ سہی مگر جدیدیت کا یہ بھی ایک پہلو ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بے سمت اور بے مقصد بہاب معاشرے کو گھن لگا دیتا ہے اور زندگی کو ہر قسم کے زندہ روحانی اور اخلاقی تجربوں سے بالکل محروم کر دیتا ہے۔ مارکس کا تو وژن یہ تھا کہ بنیادی ضرورتیں کم سے کم جسمانی محنت سے پوری ہوں اور انسان اپنے توار کو تخلیقی عمل میں جو روحانی بالیدگی کا باعث ہوتا ہے، صرف کرے۔ اس سے نہ صرف انسان کی اپنی ذات بلکہ انسانی سماج بھی نئی نئی کیفیتوں اور تجربات سے مالا مال ہوگا۔ سوشلسٹ معاشرے کی ایک نظریاتی سمت ہوتی ہے۔ (ہم یہاں موجودہ سوشلسٹ معاشروں سے بحث نہیں کر رہے ہیں، یہ بالکل الگ سوال ہے اور بڑا ہی بحث طلب سوال ہے) اور زندگی کا ایک خاص مقصد

لیکن امریکہ اور یورپی ممالک کا معاشرہ اس سمت اور مقصد سے محروم ہے۔ سرمایہ داروں
کا اس معاشرے میں ایک ہی مقصد ہے زیادہ سے زیادہ منافع کمانا اور نچلے طبقوں سے
تعلق رکھنے والے افراد کا مقصد ہے مشین کی طرح کام کرنا اور مادی اشیاء کا زیادہ سے
زیادہ استعمال تاکہ سرمایہ داروں کا منافع بڑھتا رہے۔ اس بے مقصد -CONSUMP
TION- کا اپنی انتہا پر پہونچنے پر وہی نتیجہ ہوتا ہے جو جرمن نقاد ہنری ملر کی دنیا
میں بیان کرتا ہے۔ ہنری ملر کی یہ دنیا محض خیالی یا فرضی دنیا نہیں ہے بلکہ آج کی مغربی
دنیا کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ایسا طرزِ زندگی بھی ادب کو صحیح تناظر سے محروم کر دیتا ہے۔ اور
لوکاچ اس سے اپنی بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ ایک معنی میں ہماری اُردو شاعری بھی جاگیر
دارانہ دور میں اس قسم کے زوال پذیر دور سے گذر چکی ہے جسے لکھنؤ کی کنگھی چوٹی کی
شاعری کہا گیا ہے۔

آٹھواں باب

جیساکہ پہلے بھی ہم اس بات پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ لوکاچ نے ادب اور جمالیات پر بہت کچھ لکھاہے، شاید دوسرے مارکسی دانشوروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مارکسی جمالیات میں لوکاچ کی تحریروں کا ایک اہم اور مخصوص مقام ہے جسے جمالیات کی کوئی تاریخ نظرانداز نہیں کر سکتی۔ بلیخانوف، لینن اور کاڈویل نے اس موضوع پر جو کچھ لکھاہے وہ محض ابتدائی تحریروں کی اہمیت رکھتاہے اور اس اعتبار سے ان کی اپنی اہمیت ہے۔ لیکن لوکاچ نے ارسطو کے جمالیاتی نظریات سے لے کر جدید یورپ کے جمالیاتی نظریات تک، اس موضوع کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور کانٹ، ہیگل اور مارکس کے جمالیاتی نظریات پر اس کی بہت گہری نظر تھی۔ یہاں لوکاچ کی جمالیات سے متعلق تحریروں کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے تو پوری کتاب درکار ہوگی لیکن ہم اختصار سے لوکاچ کے مارکسی جمالیات پر خیالات کا جائزہ لیں گے۔

لوکاچ سب سے پہلے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے کہ مارکس اور اینگلس نے اس موضوع پر باقاعدہ کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ یہی نہیں باقاعدہ کوئی مضمون بھی نہیں لکھاہے۔ مارکس کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے سب سے زیادہ پسندیدہ ادیب بالزاک پر کوئی کتاب لکھے مگر اسے اس کی فرصت ہی نہیں مل سکی۔ یہ محض اس کا خواب ہی رہا۔ یہ عظیم مفکر اپنے بنیادی معاشیات پر کام میں اتنا مصروف رہا کہ وہ بالزاک پر لکھ سکا نہ ہیگل پر۔ معاشیات پر اپنا کام ختم کرنے سے پہلے ہی داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ لیکن مارکس اور اینگلس نے اپنے خطوط، مضامین وغیرہ میں ادب اور جمالیات سے متعلق بہت

کچھ لکھا ہے جو ان صفحات میں بکھرا پڑا ہے۔ ان بکھری ہوئی تحریروں میں ہمیں جمالیات اور ادب سے متعلق بہت کچھ مل جاتا ہے جو بہت قیمتی ہے۔ اور ہمیں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ یہ تحریریں بکھری ہوئی ہی کیوں نہ ہوں ان میں ایک تسلسل اور باقاعدگی ہے اور ان کو جوڑ کر باقاعدہ ایک جمالیات کا نظریہ بن سکتا ہے۔ مارکسی جمالیات کے دو پہلوؤں کی طرف لوکاچ خاص طور سے ہماری توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مارکسی نظام — جدید بورژوا فلسفے کے مقابلے میں — مکمل تاریخی عمل سے گریز نہیں کرنا چاہتا۔ مارکس اور اینگلس کے مطابق ایک ہی ہمہ گیر سائنس ہے اور وہ ہے تاریخ کی سائنس جو اپنے دامن میں نیچر، سماج اور فکر کی ارتقاء کو سمیٹ لیتا ہے کیونکہ یہ تاریخی عمل کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

مارکسی نظریہ علوم کی مختلف شاخوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتا جیسا کہ بورژوا عالم کا طریقہ ہے۔ وہ انفرادی سائنسی علوم ہوں یا اس کی مختلف شاخیں یا آرٹ کی دنیا، ان کا تاریخی عمل سے الگ خود مختار وجود نہیں ہو سکتا۔ ان کی اپنی داخلی جدلیات نہیں ہو سکتی۔ اس کا ارتقاء بھی تاریخ کے ارتقاء اور پیداواری قوتوں کے ارتقا کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مختلف میدانوں میں جو تبدیلی یا ارتقاء رونما ہوتا ہے وہ اسی بنیادی تبدیلی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اسے بالکل میکانکی طریقے سے سمجھ لیں۔ لوکاچ ہمیں اس قسم کے خطرے سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ کچھ برائے نام مارکسٹ دکھاوا کرنے والے مارکسٹ ایسا کچھ کر گزریں۔ وہ مارکسی دانشور جو مارکسزم کی صحیح اسپرٹ سے واقف ہیں اس قسم کی غلطی سے اپنا دامن بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ یہاں ہم اس بحث میں اُلجھے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مارکس یا اینگلز نے کبھی بھی انسانی عمل کے مختلف میدانوں کی خود مختاری سے انکار نہیں کیا وہ کیا چاہے قانون یا سائنس کے میدان میں ہو، یا فن کے میدان میں۔

پیداواری رشتے ایک معنیٰ میں بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔ یہ رول بنیادی ہوتا ہے اس معنیٰ میں کہ اس بنیاد پر بنے ہوئے سارے تصورات بڑے اہم ہیں۔ لیکن انہوں نے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کیا کہ نئے ——— اور پرانے تصورات میں ایک رشتہ ہوتا ہے جو ٹکراؤ اور تصادم کے ساتھ ساتھ ارتقاء کی منازل سے بھی گذرتا رہتا ہے مارکس

اور اینگلس صرف اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ سائنس یا ادب کی دنیا میں تصورات کے ارتقا کو خود داخلی عمل کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ دراصل ارتقاء خارجی عمل کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ جیسے جیسے پیداواری قوتیں اور رشتے ارتقا پذیر ہو کر بدلتے ہیں، ادبی اور جمالیاتی تصورات بھی تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لیے مارکسزم کے صحیح تصور پر زور دیتے ہوئے لوکاچ کہتا ہے کہ "ادب کے وجود، مواد، اٹھان اور اثر کو مکمل تاریخی سیاق میں ہی اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ادب کا اٹھان اور ارتقا مکمل تاریخی سماج عمل کا ہی حصہ ہے ادب کی جمالیاتی روح اور قدر اور اس کا اثر اس عمومی اور متحدہ INTEGRATED سماجی عمل کا حصہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے شعوری عمل سے دنیا پر فتح حاصل کرتا ہے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ کے نزدیک جمالیات کوئی مجرد تصور نہیں ہے جس کا تعلق محض انسان کی داخلی دنیا سے ہو جیسا کہ آدرش وادی ہمیں باور کرانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ جمالیات ہماری زندگی، سماجی عمل، تاریخی ارتقاء اور پیداواری قوتوں سے اٹوٹ رشتہ رکھتی ہے اور ان سب سے الگ کر کے ہم اس کا کوئی صحیح تصور قائم نہیں کر سکتے۔ یہ بات جمالیات کے مختلف میدانوں پر لاگو ہوتی ہے وہ فن تعمیر کا میدان ہو یا مصوری کا، ادب کا میدان ہو یا موسیقی کا۔ سماجی اور تاریخی ارتقاء کے ساتھ جمالیاتی قدریں ان سبھی میدانوں میں بدلتی رہی ہیں۔ کلاسیکی دور میں اگر بنیادی جمالی قدر ہم آہنگی HARMONY تھی تو دور وسطیٰ میں تقدس کو یہ مرتبہ حاصل تھا۔ صنعتی انقلاب سے پہلے عام انسان یا پچھلے ہوئے طبقے ادب اور جمالیات کا موضوع نہیں بن سکتے تھے لیکن صنعتی انقلاب نے جمالیاتی قدروں کا اسکوپ وسیع کر کے انہیں بھی اپنے دائرے میں داخل کر لیا۔ اس انقلاب کے بعد ناول، مصوری اور فن تعمیر کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب بنیادی جمالیاتی قدر نہ ہم آہنگی رہی نہ تقدس۔ فن تعمیر میں FUNCTIONALISM نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی تو مصوری میں اکسپرشنزم، امپرشنزم، سُرریلزم، کیوبزم، سمبولزم جیسے مکتوب نے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جمالیاتی قدریں بھی سماجی تاریخی اور پیداواری اسلوب میں تغیر کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

مارکسی طریقہ کار میں تخلیقی قوت اور انفرادی عمل کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور

لوکاچ اپنی جمالیاتی تحریروں میں اس بات پر خاص طور سے زور دیتا ہے۔ لوکاچ کہتا ہے کہ: ”مارکسی تاریخ میں ارتقار کے تصور کے مطابق، آدمی جانور سے اپنے کام کے ذریعے ہی ممیز ہوتا ہے۔ ایک فرد کی تخلیقی سرگرمی انسان کی خود اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کی ہے انسان کو اپنے کام کے ذریعے انسان بنانے کی کوشش ہے۔ اس ارتقا کی خصوصیت، صلاحیت اور سطح فطری اور سماجی حالات متعین کرتے ہیں۔ تاریخی ارتقا کا یہ تصور مارکسی سماجی فلسفے اور نتیجے کے طور پر مارکسی جمالیات کی بنیاد ہے۔ ایک جگہ مارکس یہ اعلان کرتا ہے کہ موسیقی ہی انسان میں موسیقی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ تصور سماجی ارتقار کے مکمل مارکسی تصور کا ہی ایک حصہ ہے:“

> ”انسان کے فطری وجود میں پوشیدہ معروضی لطافتوں کے اظہار کے ذریعے انسان کے داخلی احساس کی تربیت کرنا یا اس کو پہلے پہل وجود میں لانا ممکن ہے۔ یہ داخلی احساس نام ہے کانوں کے موسیقی سے آشنا ہونے کا اور فن کارانہ بصیرت کا۔ یہ وہ احساس ہے جو انسان میں لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور جو انسان ہونے کی خصوصیت کو جلا دیتا ہے۔“

ساتھ ساتھ مارکس مندرجہ ذیل بات پر بھی زور دیتا ہے جو جمالیات کے طالب علم کے لیے خاص طور سے بہت اہم ہے ”حواس خمسہ کی ترتیب ماقبل کی تاریخ کا کام ہے وہ حس جو سخت ضرورت کے حدود میں مقید ہو محدود احساس رکھتی ہے۔ بھوک سے بے حال انسان کے لیے مہذب کھانے کے طریقے کا کوئی وجود نہیں ہوتا، صرف غذا کا مجرد تصور ہوتا ہے۔ یہ غذا بالکل خام اور جانوروں کے کھانے (چارہ) سے مشکل ہی سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک بے حس اور ہر طرح سے مایوس انسان کے لیے بہترین غذا کی کیا قدر ہو سکتی ہے، ایک معدنیات کا خوردہ فروش صرف اس کی بازار میں ملنے والی قیمت سے سروکار رکھتا ہے اس کی خوبصورتی یا خصوصیات سے نہیں۔ اس کی کوئی معدنیاتی حس نہیں ہوتی“۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے حواس بھی معروضی ارتقار کا نتیجہ ہوتے ہیں یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ انسانی حواس ماقبل A PRIORI ہی سے پوری طرح پختہ ہوتے ہیں۔ انسان کی اپنی ذاتی تخلیقی سرگرمیاں اس کے حواس کو ارتقار کی اگلی منزلوں

تک لے جاتی ہیں۔ اور یہ پختہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

لوکاچ ہر طرح سے مارکسی نظریات کی میکانکی تعبیر سے یا اس کی مہمل شکل سے اپنا دامن بچاتا ہے لوکاچ زور دے کر یہ بات کہتا ہے کہ ”مہمل مارکسزم کے برخلاف تاریخی مادیت اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ نظریاتی ارتقا میکانکی یا ماقبل معین طریقے سے سماج کی معاشی ترقی کے ساتھ جڑا ہوا نہیں ہوتا۔ ابتدائی کمیونزم یا طبقاتی نظام کی تاریخ میں (وہ سماج جس کے بارے میں مارکس اور اینگلس نے لکھا ہے) یہ بات کبھی حتمی نہیں رہی کہ ہر سماجی یا معاشی ترقی کے ساتھ ادب، فن اور فلسفے کی بھی ترقی ہوئی ہو۔ یہ بات بالکل حتمی نہیں ہے کہ ایک نچلی سطح کے سماج کے مقابلے میں ایک ترقی یافتہ سماج کا ادب فن اور فلسفہ بھی ارتقا کی اعلیٰ منزلوں پر ہوگا“۔ اس بات کے ثبوت میں لوکاچ مارکس کا یونانی فن اور ادب کے بارے میں مشہور اقتباس پیش کرتا ہے جس میں مارکس نے کہا ہے کہ یونان جب معاشی اور سماجی ترقی کی ابتدائی منزلوں میں تھا تب بھی اس کا فن، ادب اور فلسفہ عروج کی منزلوں کو چھو رہا تھا۔ سماجی اور معاشی ترقی اور فن کی ترقی میں غیر ہم آہنگی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے لوکاچ کہتا ہے کہ وہ شخص جس نے مارکسزم کو اچھی طرح سمجھا ہے کبھی ادب اور فن کا SCHEMATIC نظریہ قائم نہیں کرے گا۔ غیر ہم آہنگی کا اصول کس طرح کسی سماج میں ظاہر ہوتا ہے یہ ایک مارکسی دانشور اس سماج کا ٹھوس تجربہ کر کے ہی سمجھ سکے گا۔ پہلے سے متصور خیالات اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کر سکتے۔

لوکاچ جمالیاتی نظریئے سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جمالیات کی تاریخ میں حقیقت کی عکاسی کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ دراصل بہت قدیم نظریہ ہے کہ فن اپنے سماج کی تصویر ہوتا ہے۔ اس نظریئے کی طرف شکسپیر نے بھی اپنے ڈرامے ہملٹ میں اشارہ کیا ہے۔ ارسطو کا نظریہ بھی یہی تھا اس وقت سے آج تک ہر جمالیات کے ماہر نے اسی بات پر زور دیا ہے۔ دنیا کے تمام عظیم رائٹروں اور فنکاروں نے جبلی یا شعوری طور پر حقیقت کے انعکاس کے اسی نظریے پر آج تک عمل کیا ہے اور انہوں نے اپنے فنکاری کے اصولوں کی وضاحت میں یہ بات کہی بھی ہے۔ ہر عظیم فنکار کی یہ آرزو رہی ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے ذریعہ خارجی حقیقت کو پیش کرے۔ حقیقت کی

ہمہ گیر اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیشکش ہر بڑے فنکار کے فن کی کسوٹی رہی ہے اور
ان میں شیکسپیئر گوئٹے، بالزاک اور ٹالسٹائی سبھی شامل ہیں۔ مارکسی جمالیات بھی
اس نظریے میں کوئی زبردست یا بنیادی تبدیلی نہیں کرنا چاہتی اور اس بات پر کسی کو حیران
ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ حیرت انہی لوگوں کو ہوگی جو پرولتاری نظریے کو بنیادی
طور پر نیا نظریہ بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس کا رشتہ فنکارانہ اوڈن گارڈزم سے جوڑ کر
ماضی سے بے تعلق ہو جانا چاہتے ہیں مارکسزم کی بنیاد رکھنے والوں کا کبھی یہ نظریہ
نہیں رہا ہے۔

اس بات کی وضاحت کر دینے کے بعد کہ مارکسی جمالیات حقیقت کے انعکاس
پر زور دیتی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی حقیقت ہے جس کا صحیح انعکاس تخلیقی
فن کے ذریعہ ہونا ضروری ہے۔ لوکاچ یہ اہم سوال اٹھاتا ہے اور اس کا جواب دینے
کی بھی کوشش کرتا ہے۔ اس حقیقت کی جس کی ہم فن میں عکاسی چاہتے ہیں، پہچان
ضروری ہے، لوکاچ کہتا ہے کہ پہلے ہم یہ طے کر لیں کہ یہ کیا نہیں ہے اس کے بعد ہم
یہ طے کریں گے کہ یہ کیا ہے۔ اس کے منفی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لوکاچ کہتا ہے
کہ:

> یہ حقیقت محض کوئی ایسی چیز نہیں جسے خارجی دنیا کے کسی ایسے فوری مشاہدے
> کا نام دیا جاسکے جو بالائی سطح پر کیا گیا ہو۔ یہ حقیقت محض کوئی اتفاقی،
> عارضی، یا ناگہانی مظہر ہے۔ اگرچہ مارکسی جمالیات کے نزدیک حقیقت پسندی
> آرٹ سے متعلق اس کے نظریے کے لباس کا سا حکم رکھتی ہے تاہم وہ کسی بھی
> اس طرح کی مادیت یا کسی اور کوشش کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے جو محض
> اس بات پر مطمئن ہو جانا چاہتی ہو کہ باہری دنیا کے محض بالائی مشاہدے
> کی تصویر کشی ہی کافی ہے۔"

حقیقت کا عرفان کرانے میں لوکاچ یہاں بہت ہی اہم بات پر زور دے رہا ہے۔ عام طور پر
مارکسی اور غیر مارکسی نقادوں نے حقیقت کو بہت ہی عام اور سطحی معنیٰ میں لیا ہے۔ خارجی مظہر
کے فوری انعکاس کو حقیقت کی صحیح عکاسی نہیں کہا جاسکتا۔ حقیقت بہت جامع، ہمہ گیر اور
تہ در تہ ہوتی ہے۔ لوکاچ ہمیں دوسری انتہا کی طرف جانے سے بھی خبردار کرتا ہے۔ وہ کہتا

ہے کہ مارکسی جمالیات فن کے نظریئے اور عمل میں دوسری انتہا پسندی کی بھی پرزور مخالفت کرتی ہے۔ یہ تصور کہ چونکہ فوری حقیقت کی نقل اصل حقیقت کی عکاسی نہیں ہے اور یہ کہ فنکارانہ ہیئت اس سطحی حقیقت سے آزاد ہے۔ اس لیے فنکارانہ حقیقت بالکل خود مختار ہے اور یہ کہ ہیئت کی تکمیل اور اس تکمیل کی کوشش ہی اصل مقصد ہے۔ جو حقیقت سے تجرید کیے گئے ہیں اور یہ کہ ہیئت کی تکمیل حقیقت سے ماورا خود مختارانہ وجود رکھتی ہے اور اس لیے فنکار کو محض اسلوب پر ہی زور دینا چاہیئے۔ مارکسی جمالیات ان دونوں انتہاؤں سے بچتی ہے۔ اس کا زور اس بات پر ہے کہ فن کا مقصد حقیقت کی کلیت کو دیانت داری سے اور صحیح طور پر پیش کرنا ہے اور دنیا کے عظیم فنکاروں کا یہی رویہ رہا ہے۔ حقیقت کی کلیت TOTALITY پر زور دے کر ہی ایک طرف فن کو فوٹو گرافک نقل سے بچایا جا سکتا ہے اور دوسری طرف تجریدی ہیئت پرستی سے۔

اگر فن کا یہ نظریہ تسلیم کیا جائے تو کچھ اور سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے لوکاچ اپنی جمالیات پر تحریروں میں بحث کرتا ہے۔ اس سلسلے میں کلیدی سوال مادی جدلیات کے علم الادراک کا ہے یعنی کہ خارجی مظہر اور اصلیت APPEARANCE AND REALITY کا سوال۔ بورژوا فکر اور بورژوا جمالیات لوکاچ کہتا ہے، اس سوال کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ فطریت NATURALISM کا نظریہ اور عمل محض میکانکی، خارجی مظہر اور اصلیت کے درمیان غیر جدلیاتی اتحاد ہے۔ اس مشکوک اور گڑبڑ قسم کے نظریئے کو اپنانے سے نہ صرف حقیقت کے خد و خال مدھم ہو جاتے ہیں بلکہ حقیقت ہی اوجھل ہو جاتی ہے۔ آدرش وادی فلسفہ۔ فن اور رسمی اسلوب پرستی میں کبھی کبھی اصلیت اور خارجی مظہر کے تضاد کا عرفان پایا جاتا ہے لیکن چونکہ اس میں جدلی طریقہ نہیں پایا جاتا یا محض نامکمل آدرش وادی جدلی طریقہ استعمال میں لایا جاتا ہے اس سے وہ متضادات ہیں جو جدلی اتحاد ہے وہ اسے اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے شیلر کے جمالیاتی مطالعے میں اور اس کے تخلیقی عمل میں ہمیں اس مسئلے کا احساس ہوتا ہے)۔ زوال پذیر ادوار میں ہمیں حقیقت کی بڑی ہی مجرد دور از کار اور مبہم تاویلیں نظر آتی ہیں اور یہ حقیقت کی بالکل ہی مسخ شدہ تعبیر ہوتی ہیں۔

مادی جدلیات کے علم الادراک EPISTEMOLOGY کا یہ بنیادی سوال اٹھانے کے بعد اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد لوکاچ مارکسی جمالیات کی رو سے حقیقت اور خارجی مظہر کے سوال پر روشنی ڈالتا ہے۔ لوکاچ کہتا ہے کہ

APPEARANCE (خارجی مظہر) اور REALITY (حقیقت)
کو اگر صحیح جدلیاتی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ دونوں خارجی حقیقت کے دو مساوی پہلو
ہیں اور یہ دونوں پہلو دراصل حقیقت کی ہی پیداوار ہیں ہمارے شعور کی نہیں جیسا کہ آدرش
وادی نظریہ مانتا ہے۔ لیکن پھر بھی ---- (اور حقیقت کے ادراک میں یہ بہت ہی اہم بات
ہے) ---- ہمیں یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ حقیقت کی کئی سطحیں ہیں ---- سطحی
وقتی حقیقت جو ایک لمحے سے زیادہ وجود نہیں رکھتی اور اس لمحاتی وجود کے بعد ہمیشہ کے
لیے ختم ہو جاتی ہے۔ وہ حقیقت جس کے عناصر اور رجحانات زیادہ گہرے ہیں جو خاص قوانین
کے تحت وجود میں آتے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں
یہی جدلیات حقیقت میں پھیلی ہوتی ہے اور مظہر اور حقیقت میں نئے نئے رشتے وجود میں
آتے رہتے ہیں۔ جب ہم اپنے تجربے کی فوری سطح کے پیچھے جھانکتے ہیں تو ہمیں کچھ اور
حقیقت نظر آتی ہے اور اس تہ در تہ حقیقت کا سلسلہ لامحدود ہوتا چلا جاتا ہے حقیقت
کے ہر مظہر کے پیچھے ایک نئی حقیقت پنہاں ہے اور اس طرح یہ سلسلہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔
حقیقی فن زیادہ سے زیادہ حقیقت کی گیرائی اور گہرائی پانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ زندگی
کی ہر طرف پھیلی ہوئی کلیت کو پا سکے۔ دوسرے لفظوں میں مظہر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت
کو زیادہ سے زیادہ گہرائی سے جانچنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اسے غیر تجریدی طریقے
سے پیش کرنے کی کوشش ہے۔ یہ ایک ایسا حرکی جدلیاتی عمل ہے جس سے حقیقت مظہر
میں بدل جاتی ہے اور اس مظہر کے ذریعہ اس کا اس طرح اظہار ہوتا ہے کہ اس عمل کا دوسرا
رُخ ہمارے سامنے آتا ہے اور اپنی حرکت کے دوران مظہر اپنی مخصوص حقیقت کو منکشف
کرتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقت کوئی جامد مظہر نہیں ہے بلکہ ان انفرادی
پہلوؤں (مختلف مظہروں) میں جدلیاتی حرکت اور ایک دوسرے میں تبدیل ہونے کا عمل
اور اس مستقل عمل میں باہم تعامل کا نام ہے۔ اس لیے حقیقی فن وہی ہے جو زندگی کو اس
کی کلیت، حرکت اور ارتقائی عمل کے طور پر پیش کرے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ کا حقیقت کا تصور کتنا گہرا، پیچیدہ اور تہ دار ہے
وہ اسے فوری تجربے یا فوری ادراک کی سطح سے کتنی گہرائیوں اور پنہائیوں تک لے جاتا
ہے۔ لیکن یہاں حقیقت کے محض ٹھہرے ہوئے ابعاد اور مختلف سمتوں کا ہی سوال نہیں

ہے جیسے کہ عمودی اور افقی VERTICAL AND HORIZONTAL ابعاد ہوتے ہیں
حقیقت کے عرفان میں جدلیاتی حرکت ـــ اس زمانے میں اور مکانی دونوں تغیر آجاتے ہیں
اور ان کا تصور بھی شامل ہے۔ حقیقت کے عرفان کے لیے اس کے زمانی اور مکانی دونوں
قسم کے مظاہر پر نظر رکھنی ہوگی اور ان زمانی اور مکانی مظاہر کے پیچھے پوشیدہ حقیقت کے
لامتناہی سلسلے کو ان کے باہم تعامل کرتے ہوئے عناصر اور پہلوؤں کے ساتھ رکھ کر دیکھنا
ہوگا۔ حقیقت کا اس قسم کا ادراک ہر فن کار کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس طرح حقیقت
کی ہمہ گیریت پر روشنی ڈالتے ہوئے لوکاچ حقیقت کے سامنے تصور اور فنکارانہ عرفان میں فرق
کو اُجاگر کرتا ہے۔ سائنس حقیقت کے عناصر کو تحلیل کر کے ان کے باہمی تعامل کا تصور
کرتا ہے جبکہ فن اس عمل کو حرکی اتحاد کی حرکت کے طور پر پیش کر کے اسے ادراکی طور پر
بامعنی بنا دیتا ہے۔ اس فنکارانہ امتزاج کی مختلف قسموں میں سب سے اہم قسم ٹائپ ہے
اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صحیح حقیقت نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے اینگلس لکھتا ہے :

”میرے نزدیک حقیقت پسندی کے معنی تفاصیل کے صحیح بیان کے ساتھ یہ بھی ہیں کہ نہایت ایمانداری
سے مخصوص کرداروں کو ان کے مخصوص حالات میں پیش کیا جائے۔

ساتھ ساتھ اینگلس یہ بھی جتا دیتا ہے کہ یہ شخصیت TYPICALITY انفرادیت کے خلاف
نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ لکھتا ہے کہ :

”ہر شخص ایک مخصوص انفرادیت کا مالک ہے مثلاً ”یہ شخص“ (DIESER)
جس کی عکاسی بزرگ ہیگل نے کی اور جیسا کہ یہ ہونی چاہئیے تھی“

مارکس اور اینگلس اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ یہ ”ٹائپ“ کلاسیکی المیئے کے
مجرّد ٹائپ کی طرح نہیں ہے اور نہ ہی ایسے شیلر کی طرح IDEALIZED UNIVER-
SALITY کہا جا سکتا ہے یا اسے ZOLA یا زولا کے بعد والے ادب کے
زمرے میں بھی شمار نہیں کرنا چاہتے یعنی کہ 'اوسط'۔ لوکاچ کے نزدیک اس
TYPICALITY کا تصور کچھ اس طرح ہے :

”اس ٹائپ کی خصوصیت اس ہمہ گیر وحدت کے غالب پہلوؤں کا اجاگر

ہوتا ہے۔ جن کے ذریعے سچّا ادب ایک گمبھیر اور متضاد وحدت کے ساتھ
زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اور یہ متضاد وحدت نام ہے ایک عہد
کے تمام انتہائی اہم سماجی، اخلاقی اور روحانی تضادوں کا، دوسری
جانب "اوسط" کی ترجمانی لازمی طور پر ان تضادوں کو کم تر اور بے جان بناتی
ہے کسی بھی عہد کے اہم مسائل کی عکاسی کا ترجمان اگر اوسط آدمی کے ذہن اور
اس کے تجربات کو بنا یا جائے تو اس سے وہ مسائل اپنی فیصلہ کن اہمیت کھو دیتے
ہیں"۔

اس لمبے اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد یہاں یہ جتانا ہے کہ ہم "ٹائپ" کو اوسط سے گڈمڈ
نہ کردیں۔ ایک عظیم فنکار اپنی تخلیق میں کبھی اوسط کردار کو مرکزی کردار بناکر پیش کرنے پر اکتفا
نہیں کرتا (اس کے بعض کردار ایسے ضرور ہو سکتے ہیں) دراصل اس کے مرکزی کردار ایسے
کردار ہوتے ہیں جو اپنے دور کے TYPICAL کردار کہے جا سکتے ہیں یعنی یہ کردار اس
دور کے تمام تضادات اور اس کی تمام خصوصیات کی جو سماجی، اخلاقی اور روحانی تضادات
اور خصوصیات ہوتی ہیں، نمائندگی کرتی ہیں۔ اور یہ تضادات ان کرداروں میں پوری شدت
کے ساتھ اُبھرتے ہیں۔ ان TYPICAL کرداروں میں جہاں بعض خصوصیات
تاریخی دور کی متعین شدہ ہوتی ہیں تو بعض کائناتی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ دراصل ایک
فنکار TYPE کے ذریعے ٹھوس، کائناتی اور ضروری خصوصیات، کائناتی اور تاریخی
اعتبار سے متعین شُدہ یا انفرادی اور سماجی اعتبار سے لازمی خصوصیات کو کامیابی کے
ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ ان TYPICAL کرداروں اور مخصوص حالات کے ذریعے
ایک فنکار سماجی ارتقار کی اہم ترین سمتوں کو اپنی تخلیقات کے ذریعے بیان کر دیتا ہے۔

لوکاچ یہ بات زور دے کر کہتا ہے کہ مارکس اور اینگلس نے، بالزاک اور شکسپیر
میں اپنے جمالیاتی اصولوں کی تعبیر دیکھی، شیلر اور زولا میں نہیں۔ بالزاک اور شکسپیر
حقیقت کو محض کیمرے کی آنکھ سے نہیں دیکھتے۔ اُن کا زندگی کا مشاہدہ بہت گہرا ہے
اور وہ دھڑکتی ہوئی زندگی کے زندہ تجربے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ زندگی کا محض تجریدی
یا میکانکی تصوّر ہرگز نہیں ہوتا۔ مارکسی جمالیات کا دراصل یہی بنیادی تقاضہ ہے۔ لوکاچ
اس سے ایک قدم اور آگے جاتا ہے اور فن کے لیے فنطاسیہ کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا

ہے۔ اس سلسلے میں وہ کہتا ہے " ہماری رائے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ (فن کے ذریعہ) جو بات پیش کی جا رہی ہے۔ وہ روزمرّہ کی زندگی سے لی جائے یا زندگی ہی سے اس کا کوئی تعلق بھی ہو۔ یعنی کہ تخلیقی تصورات کے آزادانہ استعمال اور فنطاسیہ کی آزادی کے مارکسی تصورِ حقیقت نگاری میں کوئی بنیادی ٹکراؤ نہیں ہے۔ مارکس نے بالزاک اور HOFFMAMM کی فنطاسیہ پر مبنی کہانیوں کو ادب کے حاصلات میں شمار کیا ہے۔

لیکن ادب میں اس آزادروی کے جواز کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی ضروری ہے کہ حقیقت کے انعکاس کی صورت مسخ نہ ہونے پائے۔ تصورات اور فنطاسیہ کئی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ کوئی بھی تکنیک بذاتِ خود اہم نہیں ہوتی۔ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ حقیقت کی صحیح عکاسی ہو رہی ہے یا نہیں۔ نظری تفاصیل اگر وہ اپنے دور کی بنیادی حرکی قوتوں کو پیش نہیں کر سکتیں تو مارکسی جمالیات میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ اور ان کے مقابلے میں بالزاک اور ہوف مین کے فنطاسیے اس لیے زیادہ قابلِ قبول ہوں گے کہ ان کے ذریعہ اس دور کی یہ تمام خصوصیات ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ اس لیے مارکسی تصورِ حقیقت نگاری حقیقت کا وہ تصور ہے جس کے ذریعہ حقیقت کا اظہار ادراکی اور فنکارانہ طریقے سے ہوتا ہو۔ یہ انعکاس کے نظریئے کا جمالیاتی میدان میں جدلیاتی استعمال ہے۔

مارکسی تصورِ حقیقت نگاری دراصل FIELDING جیسے عظیم فنکاروں کے فنی نظریئے کو رد نہیں کرتی بلکہ ان کے فنکارانہ عمل کے اپنے حقیقت نگاری کے نظریئے میں جذب کر لیتی ہے۔ مارکس ان حقیقت نگاروں کے فن کی بڑی قدر کرتا ہے باوجود اس کے کہ وہ اپنے آپ کو بورژوا فنکار قرار دیتے تھے۔ مارکس نے اس سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے اپنے داماد PAUL LAFARYUE جو خود ایک غیر معمولی فرانسسی سوشلسٹ ادیب تھا سے کہا تھا:

" بالزک نہ صرف اپنے عہد کے سماج کا مورخ تھا بلکہ وہ ایسے کرداروں کا بھی پیغمبرانہ خالق تھا جو لوئس فلی پے کے زمانے میں اپنی ابتدائی شکل میں تھے ایسے کردار جنہیں بالزک کے بعد نپولین سوم کے عہد میں اپنی پوری بلوغت کے ساتھ نمودار ہونا تھا۔

مارکسی جمالیات اس طرح، ہم دیکھتے ہیں، معروضیت سے بنیادی تعلق رکھتی ہے۔

مارکسی جمالیات کا سارا زور اس بات پر ہے کہ حقیقت کو ادب میں اس طرح منعکس کیا جائے جیسی کہ وہ معروضی اور اصل میں ہے۔ دراصل اس معاملے میں مارکسی جمالیات کے نقادوں سے کافی لغزشیں ہوئی۔ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ مارکسی جمالیات تخلیقی فنکار کے موضوعی رول کو اہمیت نہیں دیتی۔ ایسے لوگوں نے مارکسی جمالیات کا گہرا مطالعہ کیے بغیر اس کی عامیانہ شکل کو بغیر تنقید کیے ہوئے قبول کر لیا۔ مارکسی جمالیات جیسا کہ اوپر حقیقت پر بحث کرتے ہوئے ہم نے بتایا ہے، حقیقت کے کسی ایک پہلو کو مکمل حقیقت تسلیم نہیں کرتی۔ مارکسی نظریے کا مرکزی مسئلہ حقیقت اور اس کے مظاہر میں جدلی رشتہ کا تعین ہے۔ ایک ہی حقیقت کے کئی متضاد مظاہر ہو سکتے ہیں اور مارکسزم ان مظاہر کی زمانی اور مکانی تغیر پذیر اور حرکی کلیت کو ہی تسلیم کرتا ہے۔ مارکسی جمالیات میں تخلیقی فنکار کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ لوکاچ کہتا ہے کہ یہ سچ ہے کہ کوئی فنکار حقیقت کو عدم سے وجود میں نہیں لاتا بلکہ موجودہ حقیقت کا انکشاف کرتا ہے۔ لیکن حقیقت کا مکمل عرفان اپنی تہ در تہ پیچیدگیوں کے ساتھ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ بڑے بڑے فن کار اکثر اس کے عرفان سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ تخلیقی فنکار کا رول مارکسی جمالیات میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ مادی جدلیات کے علم الادراک EPISTEMOLOGY کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حقیقت کی کلیت کا عرفان اور فن میں اس کی تخلیقی پیشکش بڑے دیدہ ور فنکار کا ہی کام ہے اور اس حد تک تخلیقی فنکار کے ذاتی رول کی مارکسی جمالیات میں بڑی زبردست اہمیت ہے اگر یہ سچ ہے کہ ایک فنکار کو ہمیں سماجی حقیقت کے عمل سے آگاہ کرنا ہے اور اسے ہمارے لیے بامعنیٰ بنا کر ہمارے اپنے تجربات کا حصہ بنانا ہے کہ اس کے قارئین میں سماجی ارتقاء کا شعور پیدا ہو سکے تو فنی تخلیق میں فنکار کے رول کی اہمیت کو ہرگز کم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف اس کی عظمت میں ہمیں وہ اضافہ کرنا ہوگا جو آج تک نہیں کیا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک فنکار غیر جانبدار ہو سکتا ہے؟ لوکاچ کہتا ہے کہ مارکسی جمالیات میں فنکار کی غیر جانبداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مارکسزم میں معروضیت پر جو زور ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سماجی عمل میں ایک فنکار غیر جانبدار رہ سکتا

ہے۔ مارکسی جمالیات بالکل بجا طور پر اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ چونکہ ایک فنکار جامد اشیاء اور ٹھہرے ہوئے حالات کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ جاری و ساری عمل کی سمت اور جوشش کی تفتیش کرتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ اس عمل کے کردار کو اچھی طرح سمجھ کر اپنے فن میں پیش کرے اور اس عمل کی تفہیم میں ہی موقف اختیار کرنے کا مفروضہ پہلے سے شامل ہوتا ہے۔ لوکاچ کہتا ہے کہ ایک فنکار کے غیر جانبدار ہونے اور سماجی تحریکوں سے الگ محض تماش بین بنے رہنے (فلابئیر کا IMPASSIBILITE کا تصور محض ایک فریب ہے)، زندگی اور فن کے بنیادی مسائل سے گریز ہے۔ کوئی ایسا عظیم فنکار نہیں ہوتا جس نے اپنے فن کے ذریعہ اپنے رجحانات کا اظہار نہ کیا ہو اور حقیقت کی پیشکش میں اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو شامل نہ کیا ہو۔

تو پھر کیا مارکسی جمالیات کا یہ دعویٰ کہ اصل میں معروضیت اس کی جان ہے غلط ہے؟ لوکاچ اس سوال کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ اور جانبدارانہ فن TENDENTIAN ART کی مارکسی تعبیر پر مختصر روشنی ڈالتا ہے۔ جانبداری کیا ہے؟ سطحی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اپنے سیاسی اور سماجی نظریئے کا پروپیگنڈا اور اپنے فن کے ذریعہ اس کے اظہار کا نام ہے مارکس اور اینگلس نے اس قسم کے سطحی نظریئے سے کبھی اتفاق نہیں کیا اور اس قسم کی بناوٹی باتوں کی خاص طور سے جب رائٹر اپنے عقیدے یا نظریئے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے معروضی حقیقت کو مسخ کرنے پر اتر آئے، سخت تنقید کی ہے۔ مارکس نے تو ان عظیم فنکاروں کے خلاف بھی احتجاج کیا ہے جو اپنے کرداروں کو اپنی فوری اور ذاتی رائے کو براہِ راست طریقے سے ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مارکس یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ایسا کر کے وہ اپنے کرداروں کو وجود کے جدلی تانے بانے میں اپنی لیاقتوں اور قابلیتوں کے پوری طرح اظہار سے روکتے ہیں:

مارکس نے لاسال کے المیہ ڈرامے پر تنقید کرتے ہوئے اُسے ایک خط میں لکھا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ آپ نے انتہائی جدید خیالات کو بھی زیادہ اونچی سطح پر ان کی اصل شکل میں پیش کرنے کی جرأت کی ہو لیکن ظاہر ہے مذہبی آزادی کو چھوڑ کر آپ کے بقیہ اہم موضوعات کا مرکز بورژوازی یونٹ ہی ہے"

اس قسم کے جانب دارانہ ادب کی مذمت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اچھا ادب جانبدار نہیں ہوتا لوکاچ اس بات پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ معروضی حقیقت کوئی واقعات کا بے ترتیب ڈھیر نہیں ہے بلکہ ایک ایسا تغیر پذیر عمل ہے جس میں کچھ رجحانات تیز تر ہوتے ہیں اور جو ایک خاص عمومی سمت میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس عمل سے اس انکار یا اس کی غلط تعبیر فن پاروں کو خاصا کمزور بنا دیتی ہیں۔ لاسال کے المیہ ڈرامے پر تنقید کرتے ہوئے یہی بات جتائی ہے۔ ادب میں جانبداری کی وضاحت کرتے ہوئے لوکاچ اینگلس کا بھی ایک مشہور بیان نقل کرتا ہے: اینگلس لکھتا ہے "میں" جانبدارانہ شاعری کا ہرگز مخالف نہیں ہوں۔ اسلئے کا باوا آدم AESCHYLUS اور طربیئے کا باوا آدم ARISTOPHANES سخت جانبدار تھے۔ دانتے اور CERVANTES بھی جانبداری میں ان سے پیچھے نہیں تھے۔ اور شلر کے KABALE AND LIEBE کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ پہلا جرمن ڈرامہ تھا جس میں سیاسی جانبداری پائی جاتی ہے۔ جدید روسی اور نارویجین جو بہترین ناول لکھتے ہیں۔ سب جانبدار ہیں۔ لیکن میں مانتا ہوں کہ یہ رجحان (جانبداری کا) حالات سے ابھرنا چاہیئے اور ایکشن کے ذریعے اسے واضح کرنے کی ضرورت نہیں پیش آنا چاہیئے اور شاعر کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے قارئین کے لیے اس تاریخی ٹکراؤ کا کوئی حل بھی پیش کرے جو وہ بیان کرتا ہے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوکاچ ZHDANOV کی طرح جانبداری کا مطلب پارٹی لائن سے وفاداری نہیں سمجھتا۔ یہ خصوصیت تو محض اسٹالن کے دور کی تھی جب ادیبوں اور مصنفوں کو اپنی تخلیقات میں پارٹی لائن کی اور اندھی وفاداری جتانے پر مجبور کیا گیا اور مارکسی جمالیات کے نقادوں نے اس قسم کے بھونڈے پروپیگنڈے کو مارکسی جمالیات کا نچوڑ سمجھ کر اس پر جا و بے جا حملے شروع کر دئیے۔ اگر کم تر درجے کے ادیبوں اور خوشامدی قسم کے فنکاروں نے ادب کو پروپیگنڈہ بنا کر پارٹی باسیس کو خوش کرنا چاہا تو ان نقادوں نے بھی —— ان تخلیقات کو مارکسی ادب کے فنکار، سمجھ کر مارکسی جمالیات کی بنیادوں پر حملے کرنے کی دھاندلی کی۔ اگر ان نام نہاد مارکسی ادیبوں نے ادب کو سستا پروپیگنڈہ بنایا تو ان نقادوں نے بھی ایمانداری کا ثبوت نہیں دیا اور کبھی بھی مارکسی جمالیات کی صحیح اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

جانبداری کے سلسلے میں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے مسائل بنیادی ہیں۔
جن پر ایک فنکار کو اپنا موقف اختیار کرنا چاہیئے؟ لوکاچ کے نزدیک یہ مسائل انسانی ترقی
کے عظیم مسائل ہیں۔ کوئی بھی عظیم فنکار ان سے بے توجہی نہیں برت سکتا۔ بغیر پرجوش
حمایت کے وہ (مخصوص کردار) تخلیق نہیں کرسکتا۔ اور نہ ہی حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچ
سکتا ہے۔ کمٹ منٹ کے بغیر ایک ادیب ضروری اور غیر ضروری میں بھی فرق نہیں کرسکتا۔
اگر سماجی ارتقاء کی کلیت کے تناظر سے دیکھا جائے تو وہ ادیب جو ترقی کا پرجوش حامی نہیں
ہے اور جو رجعت پرستی سے دلی نفرت نہیں کرتا، جو اچھائی سے پیار اور برائی سے پرہیز
نہیں کرتا، وہ عظیم ادب کی ضروریات کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا
ہے اور لوکاچ ہماری توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے کہ ہر بڑے فنکار کو سیاسی اعتبار سے
بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنا چاہیئے؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ادب کی تاریخ میں عظیم
رائٹروں کی ایک بڑی تعداد اس قسم کا جھکاؤ نہیں رکھتی تھی۔ شیکسپیر، گوئٹے والٹر اسکاٹ
اور بالزاک کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا جھکاؤ بائیں بازو کی سیاست کی طرف
تھا۔ مارکس اور اینگلس اس اہم سوال سے کتراتے نہیں، وہ اس کا گہرا تجزیہ کرتے ہیں۔
اینگلس نے MARGRRET HARKNESS کے نام سے مشہور خط میں اس
کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیسے بالزاک سیاست میں ROYALIST
اور LEGITIMIST اور زوال پذیر اشرافیہ کا مداح تھا جبکہ اپنی تحریروں
میں اس کے برخلاف سمت میں جاتا دکھائی دیتا ہے۔ بالزاک کی تخلیقات میں ہمیں ٹوٹتے
ہوئے اشرافیہ سماج کا مرثیہ ملتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ممدوحوں یعنی اشرافیہ
پر بھرپور طنزیہ وار کرنے سے نہیں چوکتا اور ان کے سیاسی مخالف یعنی ریپبلکنس کو اپنے
دور کے ہیرو بنا کر پیش کرتا ہے۔ اینگلس مذکورہ بالا خط میں لکھتا ہے:

"بالزاک اس بات پر مجبور تھا کہ اپنے طبقے کی ہمدردیوں اور اپنے سیاسی
تعصبات کے خلاف عمل پیرا ہو۔ اسے نظر آرہا تھا کہ اس کا محبوب طبقہ اشرافیہ
مائل بہ زوال تھا چنانچہ اس کا نقشہ اس نے اس طرح کھینچا جیسا کہ ان کا انجام
ہونے والا تھا گویا اس نے مستقبل کے ان انسانوں کی نشان دہی کی ہے جو خود

اس کے عہد میں دیکھے جا سکتے تھے چنانچہ میں اسے حقیقت پسندی کی راہ اسے بوڑھے
بالزک کی ایک شاندار کوشش اور ایک نمایاں کامیابی تصور کرتا ہوں ؛

بات بہت واضح ہو جاتی ہے۔ بالزاک کی عظمت ایک فنکار کے طور پر اس بات میں مضمر ہے
کہ اس نے اپنی تخلیقات میں اپنے ذاتی تعصبات کا چشمہ پہن کر خارجی حقیقت کا جائزہ
لینے کی کوشش نہیں کی۔ جہاں اسے حقیقت اپنی خواہش کے برخلاف نظر آئی اسے اسی
طرح بلا جھجک پیش کر دیا۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اپنے ذاتی تعصبات سے
اٹھ کر بہت کم لوگ حقیقت کا جائزہ لینے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ لوکاچ کہتا ہے کہ ایک
فنکار کی عظمت کا راز اس کی UNCOMPROMISING ایمانداری میں ہے جو ہر قسم
کے غرور سے پاک ہو۔ ان کے لیے حقیقت محض اپنی ذاتی آرزوؤں کا پرتو نہیں بلکہ مشقت آمیز
اور ایماندارانہ تحقیقات کا نتیجہ ہوتی ہے، ذاتی اغراض اور امنگیں چاہے اس کے کتنے ہی خلاف
کیوں نہ ہو۔ ایک عظیم فنکار کی ایمانداری اس بات میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو
آزادانہ طور پر DEVELOP ہونے دیں یہاں تک کہ ان کی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار
ہو جائے اور ایسا کرنے میں چاہے اس کے ذاتی تیقنات غیر شخصی حقیقت کی جدلیات
میں تحلیل ہی کیوں نہ ہو جائے ہیں CERVANTES بالزاک اور ٹالسٹائی
میں ایسی ہی ایمانداری نظر آتی ہے۔

لوکاچ کو بنیادی طور پر بالزاک کی عظمت اس بات میں دکھائی دیتا ہے کہ وہ انسانی
شخصیت کی سالمیت کو بہر حال بچانا چاہتا ہے۔ نئے ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ سماج میں
اسے ٹوٹتے ہوئے جاگیردارانہ سماج کی طرح انسانی شخصیت کی سالمیت کا المیہ نظر آتا ہے اور
وہ اس سماج پر بھی بھرپور وار کرتا ہے۔ اس کے کئی کردار ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ سماج
کے تضادات کو پوری شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بالزاک نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ نظام
باوجود انسانی شخصیت کو مسخ کرنے اور توڑنے کے ، فیوڈل نظام کے مقابلے میں انسانی
سماج کو اگلی ارتقائی منزل تک لے جانے والا ہے۔ بالزاک خود سیاسی اور سماجی طور
پر دائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا لیکن وہ اپنے دوسرے دائیں بازو کی طرف جھکاؤ
رکھنے والے ساتھیوں کے برخلاف سماج کی سخت گیر حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا
تھا۔ اس طرح لوکاچ بالزاک کی مثال سے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ ایک عظیم

فنکار کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سیاست میں کسی خاص سمت میں ہی جھکتا ہو ظاہر ہے کہ کئی کمتر درجے کے ترقی پسند ادیب ان صلاحیتوں کے مالک نہیں تھے اور انہوں نے ادب کو اپنی ذاتی امنگوں اور داخلی تعصبات کی آماجگاہ بنالیا اور نتیجے میں بھونڈا ادب پیدا ہوا ایسے بھونڈے ادب پر حملے بالکل حق بہ جانب نہیں لیکن ایسے ادب کو مارکس ادب سمجھ لینا بھی بڑی بھاری غلطی ہے۔

لوکاچ یہ بات زور دے کر کہتا ہے کہ مارکسی ادب میں حقیقت نگاری کی فتح کا یہ مطالبہ ہے کہ ہم ادب کے عامیانہ تصور سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھیں۔ یہ عامیانہ رویہ رائٹر کے سیاسی رجحان کو، اس کی نام نہاد طبقاتی نفسیات کو پیمانہ بنا کر، میکانکی طریقے سے جانچنے کا نام ہے۔ مارکسی رویہ ادب کو ٹھوس اور پیچیدہ حقائق کی روشنی میں تاریخی اسپرٹ کے ساتھ اور سوشلسٹ دروں بینی کی مدد کے ساتھ جانچتا ہے۔ مارکسی جمالیات عامیانہ یا سوقیانہ تصورات کی ہرگز حامل نہیں ہو سکتی۔ لوکاچ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ سوشلسٹ ہیومانزم مارکسی جمالیات کا قلب ہے اور تاریخ کا مادی تصور اس کا دماغ۔ ایک کمیٹیڈ ادیب کے لیے اس کی آئیڈیالوجی بہت اہم ہے۔ لوکاچ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ آئیڈیالوجی انسانی شعور کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ اپنے کردار کا خاکہ ابھارنے میں ادیب کی آئیڈیالوجی اہم رول ادا کرتی ہے کیونکہ کردار کے تصور میں جہاں گہرے ذاتی تجربے اور داخلی زندگی کا دخل ہوتا ہے وہیں اس دور کے عمومی مسائل کے عرفان کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عرفان آئیڈیالوجی کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

ہم نے اوپر کے صفحات میں لوکاچ کی زندگی سے متعلق واقعات اور اس کی ادبی سیاسی فلسفیانہ تصنیفات کا جائزہ لیا ہے۔ لوکاچ نے بہت کچھ لکھا ہے ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور بہت کچھ جرمن میں ہے اور اس کا ابھی تک ترجمہ بھی نہیں ہے۔ ان تمام حدود کے باوجود جو کچھ لوکاچ پر یا لوکاچ کا انگریزی زبان میں میسر ہے اُسے سامنے رکھ کر ہم نے اس کی زندگی اور تحریروں کا جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنی موت سے چند دنوں پہلے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہا۔ اپنی موت سے قبل PROLEGOMENA پر کام کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی سوانح حیات پر نوٹس بھی لکھتا جا رہا تھا۔ انہی دنوں وہ عملی میدان میں بھی اتنے ہی جوش و خروش سے متحرک تھا۔ امریکہ کی ANGELA DAVIS کو بچانے کے لیے وہ بین الاقوامی سطح پر دانشوروں کو منظم کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اتنی بھرپور علمی اور عملی زندگی گذار کر لوکاچ ۴ جون ۱۹۷۱ء میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

اصغر علی انجینیر نے ایک نہایت مذہبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد بوہرہ جماعت کے عامل رہے۔ جیسے تیسے گزر بسر ہوئی۔ مادری زبان گجراتی، ماحول کی زبان ہندی اُردو، ابتدائی تعلیم کلاسیکی عربی اور جب کالج میں پہنچے تو سائنسی مضامین لیے اور سول انجینیر ہو کر نکلے۔ یونیورسٹی میں جرمن زبان اور ادبیات کے سنجیدہ مطالعے نے، معاشیات، فلسفہ اور تاریخ کی لگن نے عقائد کی بنیاد کو نہیں چھیڑا دیواریں ہلا دیں۔ بمبئی میں ملازمت ملی، جماعت کی اصلاح کا جذبہ بیدار ہوا، انقلابی سوشلزم سے حدت و حرارت ملی نتیجہ میں کئی جان لیوا حملوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اس عالمِ باعمل کا جہاد بند نہ ہوا۔ تاریخ عالم اور فلسفہ اسلام کے علاوہ ادبی رجحانات اور ہنگامی موضوعات پر لکھنے کا عمل جاری ہے۔ انگریزی، گجراتی اور اُردو کے اخبارات ورسائل میں ان کے مضامین کو وقیع نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انگریزی میں دو کتابیں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اُر[دو میں] ان کی زیرِ نظر تصنیف دوسری کتاب ہے۔ اس میں جدید دور [کے ایک] بہت اہم نقاد "لوکاچ" کی زندگی اور تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا [گیا] ہے۔ ادب کے طالب علم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ [illegible]رہے ہے ان کی دوسری کتاب "مسلمان اور عالمِ اسلام" جلد [illegible]ری۔

ناشر: دارالاشاعت ترقی دہلی، ۱۴۱۰/۳، رام نگر، شاہدرہ دہلی

تقسیم کار: عصری بک ڈپو، ۱۴۱۰/۳، رام نگر، شاہدرہ دہلی